قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ماہنامہ ——— لاہور

خط و کتابت
ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ)
۲۵/بی۔ گلبرگ ۲، لاہور ۱۱
پوسٹ کوڈ ——— ۵۴۶۶۰
ٹیلیفون : ۸۷۶۲۱۹

فہرستِ مضامین

لمعات	ادارہ	۳
شراب نوشی	بشیر احمد عابد	۱۸
سپریم لاء، قرآن یا قرآن و سنت	علی محمد چدھڑ	۲۶
مرے ہمنوا	تسنیم آصف	۳۷
روزہ کے احکام	ادارہ	۴۰
اللہ کی ضمانت	محمد قاسم نوری	۴۵
قومی سوچ کا سورج	ملک حنیف وجدانی	۴۹
تصورِ توحید	حافظ محمد یعقوب تاجک	۵۳
رمضان شریف اور نمازیں	مزمل حسین بخاری	۵۶
بچوں کے لئے	علامہ غلام احمد پرویز	۶۲
نقد و نظر	ادارہ	۶۴

80. Dr. S.Abdul Wadud "MALAIKA"

مجلسِ ادارت

مُدیرِ مسئول : محمد لطیف چوہدری
معاون : ثریا عندلیب
ڈاکٹر صلاح الدین اکبر

ناشر : عطاء الرحمٰن آرائیں
طابع : سید عبدالسلیم
مطبع : آفتاب عالم پریس
۱۳۔ ہسپتال روڈ۔ لاہور
فون۔ ۶۲-۳۹۲

مقامِ اشاعت : ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲، لاہور ۱۱

جلد ۴۶ ——— مارچ ۱۹۹۳ء ——— شمارہ ۳

بدلِ اشتراک
سالانہ
پاکستان ——— ۱۲۰ روپے
بیرونی ممالک ——— ۱۸ امریکی ڈالر

فی پرچہ : -/۱۰ روپے

سالانہ کنونشن ۱۹۹۳ء

امسال طلوعِ اسلام کی سالانہ کنونشن اپنے روایتی وقار و سنجیدگی اور سادگی و شادابی
کے ساتھ

ادارہ طلوعِ اسلام، واقعہ بی/۲۵، گلبرگ ۲ لاہور میں

پروگرام

جمعرات ۸ اپریل ۱۹۹۳ء

۹½ بجے صبح تعارفی اجلاس۔ صرف مندوبین کے لئے۔

۳ بجے کھلا اجلاس
خطابات بعنوان

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں (غالب)

جمعۃ المبارک ۹ اپریل ۱۹۹۳ء

۹½ بجے صبح بزمِ مذاکرہ۔ خطابات کالج طلباء۔ بعنوان

ہر سینے میں اک صبحِ قیامت ہے نمودار
افکار جوانوں کے ہوئے زیر و زبر کیا!

یہ انعامی مقابلہ ہوگا جس میں کالج اور یونیورسٹی کے طلباء و طالبات حصہ لے سکیں گے

- جیسا کہ آپ کو معلوم ہے طلوعِ اسلام کے اجلاس کی حیثیت عام پبلک جلسوں جیسی نہیں ہوتی۔ یہ ایک طرح کی فکری محفلیں ہوتی ہیں جن میں نظم و ضبط اور آدابِ مجلس کو خاص طور پر ملحوظ رکھا جاتا ہے۔
- باہر سے آنے والے مہمانوں کے لئے بشرطِ اطلاع، رہائش کا بندوبست کر دیا جائیگا۔

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

زیرِ نظر شمارہ کے لمعات، محترم پرویز صاحب کے رشحاتِ قلم کی نذر ہیں ـــــ (مدیر)

طریقِ کار

پرویزؒ

ذیل کا خط ملاحظہ فرمایئے:۔

مکرمی و محترمی جناب پرویز صاحب!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

آپ کی کتاب "ISLAM A CHALLENGE TO RELIGION" "پر" پاکستان ٹائمز " میں ریویو اور اس کے بعد اس پر ایک خط ۲۵ اکتوبر ۱۹۶۹ء نظر سے گزرا۔ واقعہ یہ ہے کہ ہر سوچنے والے شخص کے سامنے یہی سوال ہے کہ

The only thing which is missing from it is the methodology of bringing into being the " *Rububiyat* Order" which forms the core of Mr. *Parwez's* social and political philosophy.

ذہن یہ باور ہی نہیں کرتا کہ آپ جو اتنے عرصے سے اس راہ کے مسافر ہیں، اس کے جواب سے معذور ہوں۔ آپ کے پاس یقیناً اس کا جواب ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ جواب اُس منزل سے پہلے ظاہر کر دیا جائے جس میں وہ جواب عمل میں لایا جا سکتا ہے۔ لیکن جو لوگ آپ کی طرح اس راہ پر چل رہے ہیں اور اس جگہ پہنچ گئے جہاں یہ سوال ان کے ذہن میں بھی پیدا ہو گیا (جیسے راقم الحروف اور اس کے چند ساتھی)۔ ان سے اس جواب کو "چھپا کر رکھنا" بھی ایک قسم کا بخل ہے جس کے آپ مرتکب نہیں ہو سکتے۔ اس لئے ازراہِ کرم مکمل طور پر یا چند سطور میں بطور

مخلص چند اشارات کی شکل میں راقم الحروف کو لکھ بھیجیں تو بندہ نوازی سے بعید نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو بیش از پیش علم و حکمتِ قرآنی سے نوازے۔

فقط والسلام!

مجھے اس مضمون کے کئی خطوط، کئی ایک دیگر احباب کی طرف سے بھی موصول ہوئے ہیں۔ اس بنا پر (نیز مسئلہ کی اہمیت کا بھی یہی تقاضا تھا) میں نے مناسب سمجھا ہے کہ ان احباب کو فرداً فرداً جواب دینے کے بجائے، طلوعِ اسلام کی وساطت سے، اس مسئلہ کی وضاحت کر دی جائے۔

میں سب سے پہلے محترم مستفسر کی خدمت میں عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ بات یہ نہیں کہ میں اس اہم سوال کے جواب کو اس منزل سے پہلے ظاہر نہیں کرنا چاہتا جس میں وہ جواب 'عمل' میں لایا جا سکتا ہو۔ میں نے جس مقصد کو اپنی زندگی کا مشن قرار دے رکھا ہے، اس میں کوئی راز ایسا نہیں جسے کسی خاص وقت تک کے لئے پوشیدہ رکھنا ضروری ہے ۔۔۔ بلکہ یوں کہیئے کہ اس میں راز کوئی بھی نہیں۔ اس میں تو کیفیت یہ ہے کہ ۔۔۔ سخنے نگفتہ ۔ چہ قلندرانہ گفتم ۔۔۔ اس قسم کی مصلحت کوشیاں، عملی سیاست کے میدان کے نبرد آزماؤں کے لئے ضروری ہوتی ہیں اور میں نے نہ اس میدان میں قدم رکھا ہے، نہ قدم رکھنے کا ارادہ ہے۔ اس لئے ہرچہ گویم قلندرانہ گویم۔ فالحمد للہ علیٰ ذٰلک!

جہاں تک میری کتاب پر تبصرہ کے ضمن میں ان ریمارکس کا تعلق ہے جنہیں مندرجہ بالا خط میں دہرایا گیا ہے۔ میں (محترم تبصرہ نگار سے معذرت کے ساتھ) جرأتِ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ان کے یہ ریمارکس بے محل تھے۔ میری کتاب کا موضوع یہ ہے کہ اسلام، ایک دین ہے، مذہب نہیں اور جب تک اسے مذاہبِ عالم کے زمرے سے الگ نہیں کیا جاتا، نہ اس کی حقیقت سمجھ میں آ سکتی ہے، نہ اس کا مقصود و منتہیٰ۔ کتاب کا بیشتر حصہ مذہب اور دین کے بنیادی فرق کی وضاحت پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد، میں نے مثبت طور پر بتایا ہے کہ قرآنِ کریم جس دین (یعنی نظامِ حیات) کو پیش کرتا ہے، اس کے اصولی خط و خال کیا ہیں اور وہ دیگر نظام ہائے حیات سے کس طرح مختلف اور متمیز ہے۔ کتاب کی ساری بحث فکری ہے اور وہ اسلام کا صحیح تصور پیش کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی کتاب کے سلسلہ میں یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ اس میں اس نظام کو پاکستان میں عملاً متشکل کرنے یا نافذ کرنے کا طریقہ کیوں نہیں بتایا گیا۔

اس حقیقت سے ہر صاحبِ نظر واقف ہے کہ فکری راہ نمائی اور عملی طریقِ کار دو الگ الگ شعبے ہیں۔ میں قرآنِ کریم کا ایک ادنیٰ سا طالب العلم ہوں اور اپنی فکری راہ نمائی اسی سرچشمۂ ہدایت سے حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ قرآنی راہ نمائی زندگی کی مستقل اقدار اور اصولی حدود کی شکل میں ملتی ہے۔ یہ اقدار اور حدود غیر متبدل ہیں۔ قرآن وہ طریقے متعین نہیں کرتا جن کے مطابق ان اقدار و اصول کو ایک نظام یا معاشرہ کے محسوس پیکر میں منتقل کیا جائے گا۔ یہ طریقے، حالات کے تقاضے کے مطابق، ہر دور (بلکہ ایک ہی دور کے مختلف اوقات) میں مختلف ہوں گے اور عند الضرورت

غیر متبدل ہوتے گا۔ یہ وجہ ہے کہ قرآن نے ان طریقوں کو خود متعین نہیں کیا۔ یہ جو ہمارے ہاں، اسلامی کے سمجھنے میں اس قدر الجھنیں پیدا ہو رہی ہیں، تو اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ لوگوں نے، ان طریقوں کو بھی جو کسی زمانے میں اس وقت کی ضروریات کے مطابق، حصولِ مقصد کے لئے وضع اور اختیار کئے گئے تھے، قرآنی اصول و اقدار کی طرح غیر متبدل اور ابدی سمجھ رکھا ہے۔ وہ طریقے، اب زمانے کے بدلے ہوئے تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکتے، اور قدامت پرست طبقہ ان میں کسی قسم کی تبدیلی کو خلافِ اسلام قرار دے دیتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ خود اسلام کے متعلق یہ خیال عام ہو رہا ہے کہ یہ کسی زمانے میں تو خوشگوار نتائج پیدا کر گیا تھا لیکن اب اس میں زمانے کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دینے کی صلاحیت نہیں، لہٰذا، ہمیں اس کے ساتھ چمٹے نہیں رہنا چاہیئے۔ ایک قرآنی مفکر اس قسم کی غلطی نہیں کرتا۔ (یا یوں کہئے کہ اسے ایسی غلطی نہیں کرنی چاہیئے۔)۔ وہ اپنے دَور کے مسائل پر غور کرتا اور ان کے متعلق جو قرآنی راہ نمائی ملتی ہے، اسے فکری انداز سے قوم کے سامنے پیش کر دیتا ہے اور طریق کار ان لوگوں کے لئے چھوڑ دیتا ہے جو اس راہ نمائی کے مطابق عملی عمارت استوار کرنا چاہیں۔ البتہ وہ اس باب میں اتنی احتیاط ضرور برتتا ہے کہ یہ دیکھے کہ جو عملی طریق اختیار کیا جائے وہ قرآن کے کسی اصول سے نہ ٹکرائے۔

یہ ہے وہ بنیادی حقیقت جسے نظر انداز کر دینے کا نتیجہ وہ اعتراض ہے جسے محترم تبصرہ نگار نے میری کتاب پر بھی وارد کیا ہے اور (دوسرے مقام پر) علامہ اقبالؒ پر بھی۔ ان کے متعلق بھی انہوں نے کہا ہے کہ اقبالؔ نے اپنے آپ کو فکری مباحث تک محدود رکھا اور حصولِ مقصد کے لئے عملی طریق کار تجویز نہ کیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ اقبالؔ کی دیدہ وری اور دور نگہی تھی جو انہوں نے ایک مفکر کے صحیح مقام اور منصب کو سمجھ لیا اور عملی طریق کار کو اس مرد سیاستدان کے سپرد کر دیا جس کی فراست اور دیانت پر انہیں اعتماد تھا۔ انہوں نے اپنے کلام میں ایک آدھ مرتبہ عملی طریق تجویز کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اربابِ نظر سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ اس میں وہ اس مقام تک نہ پہنچ سکے جو بہ حیثیت مفکر انہیں حاصل تھا۔ اور اسی لئے انہوں نے پھر اس کی کوشش نہیں کی۔ کلامِ اقبالؒ میں ان کی مثنوی — پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق — کو ایک خاص مقام حاصل ہے — بہت بلند مقام — اس مثنوی کے نام سے (جو اُن کا اپنا تجویز کردہ ہے) واضح ہوتا ہے کہ اس وقت انہوں نے عملی طریق کار کے تعین کی اہمیت کو محسوس کیا تھا لیکن اس باب میں جو کچھ انہوں نے کہا وہ اس حقیقت کا غماز ہے کہ وہ ان کی آزادانہ فکری تخلیق نہیں تھا، ماحول کے اثرات کا نتیجہ تھا اور اسی لئے اسے چنداں اہمیت حاصل نہ ہو سکی۔ اُس زمانے میں مسٹر گاندھی کی سودیشی تحریک کا عام چرچا تھا۔ چنانچہ اقبالؒ نے بھی اپنی قوم سے کہا تو یہی کہ

آنچہ از خاکِ تو رُست اے مردِ حُر
آں فروش و آں بپوش و آں بخور

آں نکو بیناں کہ خود را دیدہ اند
خود گلیم خویش را بافیدہ اند

اور تاریخ اس پر شاہد ہے کہ (اقبالؒ کو اپنا فکری مرشد تسلیم کرنے کے باوجود) قائدِ اعظمؒ کی عملی سیاست کی نگہ نتائج شناس نے طریقِ کار کے اس مشورہ کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا اور نہ ہی اقبالؒ نے اس پر زور دیا ــــ قائدِ اعظم تو ایک طرف خود مسٹر گاندھی نے دو ہی قدم آگے جا کر اس طریق کو گردِ کارواں کی طرح پیچھے چھوڑ دیا تھا ــــ حتّٰی کہ اہمسا (عدم تشدد) کو بھی جو اس کے نزدیک اس کے دھرم کا جزو تھا ــــ عملی سیاست کے تقاضے ایسے ہی ہوتے ہیں۔

اب آیئے ہم دیکھیں کہ قرآنی نظامِ ربوبیت جب (صدرِ اوّل میں) پہلی بار عملاً متشکل ہوا تھا تو اس کی صورت کیا تھی۔ لیکن اس سے پہلے، چند الفاظ میں اسے سمجھ لیجئے کہ اس نظام کی عمارت کس بنیاد پر استوار ہوئی تھی (اور استوار ہوگی)۔ وہ سنگِ تاسیس یہ تھا کہ

> ہر شخص اپنی اپنی صلاحیت کے مطابق، مفوضہ امور کو نہایت محنت اور جانفشانی سے سرانجام دے اور اس کے ماحصل میں سے، بقدرِ اپنی ضرورت کے لے کر، باقی سب دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دیدے۔ بلکہ بعض حالات میں، دوسروں کی ضروریات کو اپنی ضروریات پر مقدم رکھے اور اس کا نہ کسی سے اجر مانگے نہ معاوضہ۔ حتّٰی کہ کسی کے شکریہ تک کا بھی متمنّی نہ ہو۔

یہ تھا اس نظام کا سنگِ بنیاد جو اسلام کا مطمحِ نظر تھا۔ آپ دیکھتے ہیں کہ یہ تصور نہ صرف اس نظامِ سرمایہ داری کے خلاف تھا جو اس زمانے میں عام تھا، بلکہ انسان کی طبیعی زندگی کے جبلّی تقاضا (INSTINCT) کے بھی خلاف۔ انسان کی طبیعی زندگی کا جبلّی تقاضا، مفادِ خویش کا تحفظ ہے۔ اسے کسی دوسرے کے مفاد کی کوئی فکر اور پرواہ نہیں ہوتی۔ اس لئے جو تقاضا، قرآنی نظام کا سنگِ بنیاد قرار پاتا ہے، وہ اسے اس کے جبلّی تقاضوں سے بلند لے جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ (حیوانی سطح پر زندگی بسر کرنے والے) عام انسانوں کے بس کی بات نہیں۔ اس کے لئے خاص انداز کے انسان کی ضرورت ہے۔ اور انسانیت سازی درحقیقت قرآنی تعلیم کا مقصود ہے۔ اسی داخلی انقلاب سے وہ جذبۂ محرکہ پیدا ہوتا ہے جس سے انسان اتنے بڑے ایثار کے لئے بطیبِ خاطر تیار ہو سکتا ہے۔ اس نظام کی تشکیل کے لئے جب نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم نے اپنی دعوت کا آغاز کیا تو اس وقت (حضورؐ کے سوا) دنیا میں کوئی مسلمان نہیں تھا۔ آپؐ نے اس نظامِ نَو کے اصول و اقدار اپنی قوم کے سامنے پیش کئے اور پیش کرتے چلے گئے۔ قوم نے اس دعوت کی مخالفت کی لیکن ان میں ایسے افراد بھی تھے جنہوں نے اس پر سکون و اطمینان سے غور و فکر کیا اور اس کے بعد جب

وہ اس کی صداقت کے متعلق، دل اور دماغ کی کامل رضامندی سے مطمئن ہو گئے تو انہوں نے اسے قبول کرنے کا اقرار کر لیا۔ اور اس طرح اس سوسائٹی کے ممبر بن گئے جس کی طرف حضورؐ دعوت دیتے تھے۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ اس زمانے میں وہی لوگ مسلمان کہلاتے تھے جو اپنے قلب و دماغ کے پورے اطمینان کے ساتھ، اس نظام کی صداقت کے قائل ہو چکے تھے۔

جو لوگ اس طرح اس سوسائٹی کے ممبر بنتے تھے، ان کی تعلیم و تربیت کا خصوصی انتظام خود نبی اکرمؐ فرماتے تھے۔ قرآنِ کریم نے جو حضورؐ کی یہ خصوصیتِ کبریٰ بیان کی ہے کہ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ تو وہ اسی حقیقت کی وضاحت کرتی ہے۔ یعنی حضورؐ انہیں اس نظام کے قوانین و ضوابط کی تعلیم دیتے تھے۔ اس کی حکمت و غایت سے آگاہ کرتے تھے اور اس طرح ان کی انسانی صلاحیتوں کی نشوونما کرتے چلے جاتے تھے۔ "صلاحیتوں کی اس نشوونما" سے مراد، صرف ذہنی صلاحیتیں نہیں، اس سے مفہوم ان صلاحیتوں کی نشوونما تقاضا بھی ہے جن کی بنیادوں پر انسانی سیرت و کردار کی بلند و بالا عمارت استوار ہوتی ہے۔ اسے انسانی ذات کی نشوونما کہا جاتا ہے۔ اسی سے ابنِ آدم، حیوانی سطح سے بلند ہو کر انسانی سطح پر زندگی بسر کرنے کے قابل ہو جاتا ہے اور یہی چیز جذبۂ محرکہ بنتی ہے اس عظیم ایثار کا جس پر اس نظام کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ جب ان میں سیرت و کردار کی اس قسم کی پاکیزگی اور پختگی پیدا ہو جاتی ہے، تو ان سے ایک عہد لیا جاتا ہے جو درحقیقت اسلامی نظامِ ربوبیت کی اصل و اساس ہے یعنی یہ عہد کہ

إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (۹/۱۱۱)۔

یہ حقیقت ہے (یونہی ذہنی عقیدت مندی نہیں) کہ مومنین نے اپنا مال اور اپنی جان خدا کے ہاتھوں فروخت کر دیئے ہیں اور خدا نے انہیں جنت کے عوض خرید لیا ہے۔

اسی جماعت کے افراد کو مومن کہا جاتا تھا۔ یعنی وہ لوگ

(۱) جنہوں نے سوچ سمجھ اور دیکھ بھال کر، برضا و رغبت، اس نظام کی صداقت کو قبول کیا۔

(۲) ان کی تعلیم و تربیت خود رسول اللہؐ نے فرمائی اور اس طرح ان کے قلب و نگاہ میں قرآنی اقدار کے مطابق انقلاب پیدا ہوتا چلا گیا۔ اور

(۳) انہوں نے اپنی جان اور مال اسی نظام کے ہاتھ فروخت کر دیا۔

رسول اللہؐ کی مکی زندگی پوری کی پوری اسی عمل تزمیلؐ (جماعت سازی) میں بسر ہو گئی اور تیرہ سال کے عرصہ میں جو افراد اس سوسائٹی کے ممبر بنے، ان کی تعداد چند سو سے زیادہ نہ تھی۔ اگر ہم اپنے اندازوں کے مطابق ماپیں تو یہ پروگرام

(بقیہ فٹ نوٹ اگلے صفحہ پر دیکھئے)

بڑا سُست خرام دکھائی دے گا۔ آپ غور کیجئے کہ حضورؐ کی عمرِ رسالت صرف تیئس سال تھی اور آپ کا عہدِ رسالت قیامت تک کے عرصہ کو محیط تھا۔ اس اعتبار سے حضورؐ کی حیاتِ طیبہ کا ایک ایک سانس صدیوں پر بھاری تھا۔ اس تیئس سال کے گراں بہا عرصہ میں سے تیرہ سال کی مدت ابتدائی عمل تزمیل میں صرف ہوگئی اور اس کا ماحصل چند سو افراد سے آگے نہ بڑھا۔ اور حضورؐ کی طرف سے یہ سب کچھ نہایت سکون و سکوت کے ساتھ ہوا۔ جو حضرات بنیادی نظریات کی تبلیغ و تعلیم کے مرحلہ کو "بے عملی" سے تعبیر کرتے ہیں اور عمل کا تصور ان کے ہاں ہنگامہ خیزی اور شورش انگیزی ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک حضورؐ کی یہ تیرہ سالہ زندگی تو "بے عملی" کا دور کہلائے گی!

اس جماعتِ مومنین کی مکی زندگی ایک اور اہم حقیقت کی بھی پردہ کُشا ہے۔ لوٹ مار، جنگ و جدال، فتنہ و فساد، عربوں کی گھٹی میں پڑا تھا، اور اس جماعتِ نَو کے افراد انہی عربوں میں سے تھے۔ اس تیرا سال کے عرصہ میں، اس جماعت کے افراد پر ہر قسم کے مظالم ہوئے۔ انہیں ناقابلِ برداشت تکالیف اور مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن ان میں سے کسی نے نہ کسی قسم کا دنگا فساد کیا، نہ لڑائی جھگڑا، نہ کسی کو لوٹا نہ کھسوٹا، نہ کہیں پتھراؤ کیا نہ گھیراؤ۔ حتّٰی کہ نہ کہیں جھوٹ بولا نہ کسی کو فریب دیا، نہ کسی سے بدمعاملگی کی، نہ کسی قسم کی عہد شکنی۔ تکلیفیں برداشت کرتے رہے، مصیبتیں اٹھاتے رہے۔ لیکن فریقِ مقابل کے خلاف نہ جھوٹا پراپیگنڈہ کیا، نہ کسی قسم کی غلط بیانی سے کام لیا۔ نہ کوئی سازش کی، نہ زمین دوز تحریک چلائی۔ جو کچھ کہا کھلے بندوں کہا۔ جو کچھ کیا علی الاعلان کیا۔ اپنے کام سے کام رکھا۔ اور جب دیکھا کہ مکّہ کے مقابلہ میں مدینہ کی فضا اس نظام کے قیام کے لئے زیادہ سازگار ہے تو نہایت خاموشی سے ہجرت کر کے وہاں چلے گئے اور جاتے وقت بھی کسی کو کسی قسم کا دھوکا دیا، نہ خیانت کی۔

مدینہ گئے تو وہاں کسی سے حکومت نہیں چھینی۔ نہ ہی ایسا ہوا کہ کوئی بنی بنائی حکومت کسی نے ان کے حوالے کر دی ہو۔ وہاں انہوں نے اپنی مملکت قائم کی ــــ "مملکت قائم کی" کے الفاظ ذرا وضاحت طلب ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ مملکت قائم کس طرح سے کی گئی تھی۔ اس کے لئے طریقِ کار کیا اختیار کیا گیا تھا۔ اس سلسلہ میں قرآن پھر ایک اصول بیان کرتا ہے اور وہ اصول ایسا جامع ہے جس میں تمام تفاصیل خود بخود سمٹ کر آجاتی ہیں۔ سورۃ النّور میں ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ۔ (۲۴/۵۵)۔

یعنی یہ مملکت نہ کسی سے چھین جھپٹ کر لی گئی تھی نہ کسی نے بطور بخشائش ہبہ کر دی تھی۔ یہ فطری نتیجہ تھی ان کے

(سابقہ صفحے کا فٹ نوٹ) رسول اللہؐ کو اسی جہت سے قرآن میں المزمّل کہا گیا ہے یعنی وہ جو رفقائے سفر کے انتخاب میں انتہائی کاوش و احتیاط سے کام لے۔

... اعمالِ صالحہ کا ــ ایمان ــ یعنی اپنے نصب العین کی صداقت پر یقینِ محکم۔ اور اعمالِ صالحہ ــ قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے، موقعہ اور محل کے مطابق مناسب اقدامات۔ (واضح رہے کہ قرآن نے "اعمالِ صالحہ" پر اتنا زور دیا ہے لیکن ان اعمال کی کوئی جامع و مانع فہرست مرتب کر کے نہیں دی۔ حتٰی کہ اس نے "امر بالمعروف و نہی عن المنکر"، کو جماعتِ مومنین اور مملکتِ اسلامیہ کا بنیادی فریضہ قرار دیا ہے لیکن (بجز چند احکام) معروف و منکر کی تفاصیل بھی خود متعین نہیں کیں۔

جب یہ جماعت صاحبِ اقتدار ہوگئی۔ یعنی وسائلِ رزق ان کے قبضہ میں آ گئے تو معاشرہ میں نظامِ ربوبیت خود بخود نافذ ہوگیا۔ بالفاظِ دیگر یوں کہیئے کہ یہ کاروان، مختلف وادیوں میں سے گزرنے کے بعد، اپنی منزلِ مقصود تک جا پہنچا۔ اُس وقت نہ کسی نے یہ سوال اُٹھایا کہ مملکت تو مل گئی ہے، اب اس میں کس قسم کا نظام قائم کیا جائے۔ نہ یہ تنازعہ پیدا ہوا کہ فلاں قسم کا معاشی نظام اسلامی ہے یا غیر اسلامی ــ انہوں نے چلنے سے پہلے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ ہم نے پہنچنا کہاں ہے۔ اس لئے منزل پر پہنچنے کے بعد، کسی کے دل میں یہ سوال نہ اُبھرا کہ یہ ہماری منزلِ مقصود ہے یا نہیں۔ ان میں سے ہر فرد جو اس سوسائٹی کا ممبر بنا تھا، سب کچھ دیکھ بھال، سوچ سمجھ کر ممبر بنا تھا۔ ان میں سے ہر ایک کو معلوم تھا ــ اور حتمی اور یقینی طور پر معلوم، کہ اس سوسائٹی کا مقصود و منتہٰی کیا ہے اور اس مقصد کے حصول کے لئے ہمارا فریضہ کیا۔ یہ افراد، اس سوسائٹی کا ممبر بننے کے بعد، اپنے آپ کو، اُس مقصد کے حصول کے لئے تیار کرنے اور اس کے اہل بننے میں مصروف رہے۔ جب انہوں نے اپنے اندر اس کی اہلیت پیدا کر لی، تو مقصد حاصل ہوگیا۔ یعنی اسلامی نظام قائم ہوگیا۔ اس کے بعد یہ لوگ اس نظام کے استحکام و فروغ اور اندرونی اور بیرونی خطرات سے اس کی حفاظت و مدافعت کے لئے مصروفِ جدوجہد رہے۔ یہ ہے وہ "طریق" جس کے مطابق صدرِ اوّل میں یہ نظام قائم ہوا۔ یعنی اس نظام کے اصول و اقدار کو بہ دلائل و براہین دوسروں کے ذہن اور دل نشین کرانا، اور جو اس طرح ان کی صداقت تسلیم کر لیں، مناسب تعلیم و تربیت سے ان کی انسانی صلاحیتوں کو اجاگر کرنا، یہی ہے وہ پروگرام جسے میں نے شروع میں انسانیت سازی سے تعبیر کیا ہے۔

اب آپ تاریخ کے اوراق کو چودہ سو سال آگے اُلٹ کر، پاکستان کی طرف آ جائیے۔ یہاں ایک ایسی قوم بستی ہے جو مسلمان کے نام سے متعارف تو ہے لیکن

(۱) ان میں سے نہ کسی نے، اسلام کو سوچ سمجھ کر اور دیکھ بھال کر، دل اور دماغ کے کامل اطمینان کے ساتھ، بطیبِ خاطر اختیار کیا ہے۔

(۲) نہ ہی ان کے سامنے اسلام کا کوئی واضح اور متعین مفہوم ہے۔

(۳) نہ ہی انہیں حتمی طور پر معلوم ہے کہ اسلامی نظام کسے کہتے ہیں اور اس کا مقصود و منتہیٰ کیا ہے۔ اور جو اسلام ان کے ہاں مروج ہے، وہ، وہ مذہب ہے جو انفرادی اور گروہی مفادات کے تحفظ کے لئے ہمارے دورِ ملوکیت میں وضع کیا گیا۔

(۴) نہ ہی (صدرِ اوّل کے مسلمانوں کی طرح) ان کی تعلیم و تربیت کا کوئی انتظام ہوا ہے۔

(۵) نہ ہی انہوں نے اپنے مقصد کے حصول کے لئے، اپنی جان اور مال کو کسی کے ہاتھ فروخت کر دینے کا معاہدہ کیا ہے۔ اور

(۶) نہ ہی یہ مملکت انہیں، ان کے ایمان و اعمالِ صالح کے نتیجہ میں ملی ہے۔

یہاں حالت یہ ہے کہ:۔

(۱) یہ قوم متفق علیہ طور پر اتنا بھی نہیں بتا سکتی کہ مسلمان کسے کہتے ہیں۔

(۲) کوئی معاملہ پیش آئے۔ ایک گروہ اسے اسلامی قرار دیتا ہے اور دوسرا غیر اسلامی۔ کوئی اسے جائز ٹھہراتا ہے کوئی ناجائز۔ ذرا ذرا سی بات پر ان میں باہمی سر پھٹول ہوتی ہے۔ ان کی بیویوں پر طلاق پڑتی ہے، ان پر کفر کے فتوے صادر ہوتے ہیں اور کوئی اتھارٹی ایسی نہیں جسے متنازعہ فیہ معاملات میں حکم تسلیم کیا جاتا ہو۔

اور تماشہ یہ کہ کوئی اس باب میں (SERIOUS) نہیں کہ اس راہ گم کردہ قافلہ کے لئے منزل کا تعین اور راستے کی وضاحت کی جائے۔ ایک طرف حکومتیں آتی رہیں اور جاتی رہیں اور ان میں سے ہر ایک کی کوشش یہ رہی کہ مملکت کا نام اسلامی رکھ کر اور آئین میں یہ شق داخل کر کے کہ ملک کا کوئی قانون اسلام (یا کتاب و سنّت) کے خلاف نہیں ہوگا، مُلّا سے جان چھڑاؤ اور عوام میں سستی شہرت حاصل کرو۔ دوسری طرف، اربابِ مذہب کی یہ کیفیت کہ اُن میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جنہوں نے اسلام کے لفظ کو اپنی مفاد پرستیوں کے لئے سپر بنا رکھا ہے اور کچھ وہ جو "مذہبی علوم" سے تو واقف ہیں لیکن اسلام کی حقیقت سے قطعاً ناآشنا ہیں اور نہ خود، جہالت کی تاریکی سے نکلنا چاہتے ہیں، نہ اپنے معتقدین کو نکلنے دینا چاہتے ہیں۔ ان کے بعد ایک گروہ ایسا بھی ہے جو (مذکورہ بالا حالات سے متاثر ہو کر) اس نتیجہ پر پہنچ چکا ہے کہ اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے، اب یہ ہمارے کسی کام نہیں آسکتا۔ یہ گروہ دل میں تو اس کا قائل ہے، لیکن معاشرتی دباؤ کے ماتحت اپنے اس عقیدہ کو اعلانیہ زبان تک لانے کی جرأت نہیں کرتا ـــــ یہ حضرات، ڈرائنگ رومز میں بیٹھے، گھنٹوں ان خیالات کا اظہار کرتے رہتے ہیں اور اس کے بعد اُٹھ کر سیدھے "داتا صاحب" پہنچ جاتے ہیں۔

یہ ہے یہاں کی مسلمان قوم اور یہ ہیں اس قوم اور ملک کے حالات! اور اس کے بعد مجھ سے پوچھا جاتا ہے کہ (تم نے قرآن پر غور و فکر کیا ہے) تم بتاؤ کہ (اس قوم میں کسی قسم کی تبدیلی کئے بغیر) یہاں قرآن کا معاشی نظام

...بیت، کس طرح نافذ کیا جائے؟

کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا!

...کسی نے پوچھنا ہے تو یہ پوچھے کہ (اقبالؔ کے الفاظ میں) اس "مسلمانے نامسلمانے[1]" کو "مسلمان" کس طرح بنایا جائے تاکہ اس کے بعد یہاں کا معاشرہ، قرآنی معاشرہ میں بدل جائے اور موجودہ غلط معاشی نظام کی جگہ نظامِ ربوبیت آجائے۔ نظامِ ربوبیت، کوئی خود کار مشین نہیں، جسے کہیں سے امپورٹ کرکے یہاں نصب کر دیا جائے اور سوئچ دبا دینے سے وہ چلنے لگ جائے۔ نظامِ ربوبیت، دل کی گہرائیوں سے اُبھرنے والی، اُمنگوں کے محسوس پیکر کا نام ہے اور یہ کسی ایسی قوم میں نفاذ پذیر نہیں ہو سکتا جس کے اعماقِ قلب میں اس قسم کی تبدیلی نہ پیدا ہوئی ہو۔ ہم تو نسلی مسلمان ہیں۔ جو بدوؔ، اسلامی مملکت کے قیام کے بعد (دل کی تبدیلی کے بغیر کسی اور تقاضا سے) حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے تھے، قرآن نے ان کے متعلق کہہ دیا تھا کہ — قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا — یہ بدو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں۔ قُلْ۔ ان سے کہہ دو۔ لَمْ تُؤْمِنُوْا۔ تم ایمان نہیں لائے۔ اس لئے ایسا مت کہو۔ وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا — تم صرف یہ کہو کہ ہم اس نظام کے سامنے جُھک گئے ہیں۔ اس لئے کہ وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِیْ قُلُوْبِكُمْ۔ ایمان ہنوز تمہارے دل کی گہرائیوں میں نہیں اُترا۔ اس کے بعد، جب تمہاری مناسب تعلیم و تربیت ہو جائے گی اور تم، اپنے دل کی کامل رضامندی سے، اس نظام کی اطاعت کرو گے، تو پھر تمہارے اندر وہ تبدیلی پیدا ہو جائے گی جسے ایمان کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ (۴۹/۱۴)

آگے بڑھنے سے پہلے، میں اس حقیقت کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ ہم مسلمان، اگر قلب و نگاہ کی تبدیلی سے مسلمان نہیں ہوئے، تو اس کے یہ معنی نہیں کہ میں موجودہ مسلمانوں کی قومی (اجتماعی) زندگی کو بیکار سمجھتا ہوں۔ بالکل نہیں۔ جب کوئی قوم، اقدار (یا آئیڈیالوجی) کے اشتراک کی بنا پر، اپنی اجتماعیت سے محروم ہو جائے لیکن وہ اس کے باوجود انفرادی زندگی کے بجائے اجتماعی زندگی بسر کرنا چاہے، تو اس کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں ہوتا کہ وہ اپنی وجہِ تعارف کو اپنی اجتماعیت کی بنیاد قرار دے لے اور اس طرح اپنے افراد کو تنکوں کی طرح منتشر ہونے سے بچا لے۔ اس قسم کی اجتماعی زندگی، انفرادی زندگی سے بہر حال بہتر ہوتی ہے بشرطیکہ اس سے، دوسروں کے خلاف نفرت کے جذبات اور سلب و نہب کی ہوس نہ اُبھرے۔ میں نے، تقسیم ہند سے پہلے، مسلمانوں کی ہیئت اجتماعیہ کو برقرار رکھنے اور اسے مستحکم کرنے کے لئے (اپنی بساط کے مطابق) جو کچھ کیا اس کا جذبۂ محرکہ یہ تھا کہ قوم کی اس ہیئت کو بہر حال قائم رکھا جائے تاکہ اس اجتماعیت سے اگر ہمیں ایک آزاد خطۂ زمین حاصل ہو جائے تو اس میں

---

[1] چہ گویمت ز مسلمانِ نامسلمانے — جز ایں کہ پورِ خلیل است و آذری داند!

قرآنی نظام کے قیام کا امکان ہو۔ ہندوستان کا ایک جزو رہتے ہوئے اس کا کوئی امکان ہی نہیں تھا۔

اور تقسیمِ ہند کے بعد، میں نے اس امکان کو مشہود بنانے کے لئے جدوجہد شروع کر دی۔ اس کے لئے کرنے کا کام یہ تھا کہ (جیسا کہ میں نے اوپر کہا ہے) اس "مسلمانِ نامسلمانے" کو مسلمان بنا دیا جائے۔ وہ مسلمان جس کے متعلق اقبالؒ نے کہا تھا کہ

"زبان" سے کہہ بھی دیا لا الٰہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں!

میں نے اس کے لئے، سنتِ رسول اللہ کے اتباع میں، طریقہ وہی اختیار کیا جسے حضورؐ نے اپنی دعوت کے آغاز میں اختیار فرمایا تھا۔ یعنی میں نے

(۱) سب سے پہلے، اپنی قوم سے کہا کہ ہمارا مروجہ اسلام، دین نہیں رہا، مذہب میں تبدیل ہو چکا ہے۔ اسے جب تک دین میں تبدیل نہیں کیا جائے گا، مطلوبہ نتائج حاصل نہ ہوں گے۔ میں نے گذشتہ بیس بائیس سال میں جو ہزارہا صفحات لکھے ہیں، تقریریں کی ہیں، درس دیئے ہیں، وہ سب اسی مقصد کے لئے تھے۔ میں نے پہلے دین اور مذہب میں فرق کر کے بتایا اور پھر مثبت طور پر دین کا قرآنی تصور قوم کے سامنے پیش کیا۔ اس کے ساتھ ہی، جو اہم معاملہ قوم کے سامنے آیا، اس کے متعلق وضاحت سے بتایا کہ قرآن اس باب میں کیا راہ نمائی دیتا ہے۔

(۲) میں نے ارباب بست و کشاد اور اصحابِ فکر و نظر سے کہا کہ موجودہ مسلمانوں سے (جیسے کچھ بھی ہم ہیں) مملکتِ پاکستان کو محفوظ رکھنے اور مستحکم بنانے کا کام لیا جائے۔ لیکن ہماری نئی نسلوں کی تعلیم و تربیت کا ایسا انتظام کیا جائے جس سے ان کے قلب و نگاہ میں وہ تبدیلی پیدا ہو جائے جسے ایمان سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ ہوگی وہ قوم جسے صحیح معنوں میں "ملتِ اسلامیہ" کہہ کر پکارا جائے گا۔ اس ملت کے وجود میں آجانے سے اسلامی معاشرہ وجود میں آجائے گا اور انہی کے قلوب سے ابھرنے والی امنگوں سے نظامِ ربوبیت قائم ہوگا۔ اس کے لئے عملی طریق کیا اختیار کیا جائے گا، اسے، وہ ملت، اس وقت کے حالات کے مطابق، خود طے کرے گی۔

یہ ہے اسلامی نظام قائم کرنے کا وہ طریقہ جسے میں اپنی قرآنی بصیرت کے مطابق سمجھ سکا ہوں اور جسے منہاجِ رسالت پر تدبر و تفکر کے بعد میں نے (اپنی استعداد کے مطابق) اختیار کر رکھا ہے، اس فرق کے ساتھ کہ حضورؐ نے تبلیغِ دین کے ساتھ، ایک الگ جماعت (اُمّت) کی تشکیل بھی فرمائی تھی اور میں نے الگ جماعت سازی سے سخت اجتناب کیا ہے اور اپنے آپ کو صرف ایک مبلغ کی حیثیت تک محدود رکھا ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔

ایک رسولؐ اپنے پیغام کے نہ ماننے والوں کو کافر قرار دیتا ہے اور جو لوگ اس پیغام کی صداقت کو قبول کر لیتے ہیں انہیں، ان کفار سے الگ کر کے، ایک متمیز اُمّت کی تشکیل کرتا ہے۔ لیکن میں تو پوری کی پوری اُمّتِ محمدیہ کو، دنیا کے جملہ غیر مسلموں (کفار) کے مقابلہ میں، ایک جماعت سمجھتا ہوں، اس لئے اس امّت کے اندر، کافر و مسلم کی تفریق کا تصور بھی میرے نزدیک معصیتِ کبریٰ اور جرمِ عظیم ہے۔ امّتِ محمدیہ کے اندر کافر و مسلم کی تفریق تو ایک طرف، قرآنِ کریم اس امّت کے اندر فرقہ بندی کو بھی شرک قرار دیتا ہے (۳۰/۳۱) اور رسولؐ اللہ سے کہتا ہے کہ ایسا کرنے والوں کے ساتھ تمہارا کوئی تعلق نہیں رہے گا (۶/۱۶۰)۔ اس لئے میں ایک الگ جماعت بنانے کی جرأت کیسے کر سکتا ہوں۔ میں دین کے متعلق قرآنی تصورات کو عام کئے جا رہا ہوں اور جو لوگ ان تصورات سے متفق ہو جاتے ہیں، ان سے کہتا ہوں کہ وہ بھی اسی طرح انہیں عام کرتے جائیں تاکہ ہماری پوری قوم کے سامنے دین کے صحیح تصورات آجائیں۔ اسی طرح جب میں، قوم کی نئی نسل کے لئے قرآنی تعلیم و تربیت پر زور دیتا ہوں اور اب (بالآخر) خود ایک درسگاہ قائم کرنے کی تجویز کو آگے بڑھا رہا ہوں، تو یہ بھی پوری قوم کے بچوں کے لئے کر رہا ہوں، کسی خاص گروہ یا پارٹی یا کسی خاص طبقہ کے بچوں کے لئے نہیں۔ میرا منصب مسلمانوں کے سامنے اس دین کا صحیح تصور لانا ہے جس کی طرف نسبت سے ہم اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں۔ جب ان کے سامنے دین کا تصور آجائے گا اور ان کے دل و دماغ میں قرآنی تبدیلی پیدا ہو جائے گی، تو وہ، موجودہ غیر اسلامی نظامِ زندگی کو قرآنی نظام میں بدلنے کے لئے طریقِ کار خود تجویز کر لینگے۔ یہ میرا مشن ہے۔

من از طریق نہ پرسم، رفیق می جویم
کہ گفتہ اند، نخستیں رفیق یا زطریق!

اس سلسلہ میں مجھ سے اکثر کہا جاتا ہے کہ جس منزل کی تم نے نشاندہی کی ہے، اس سے تو ہم متفق ہیں لیکن اس تک پہنچنے کے لئے جو راستہ تم تجویز کرتے ہو وہ بہت لمبا ہے اور زمانہ آج بڑی برق رفتاری سے آگے بڑھ رہا ہے۔ اس لئے یہ تو ــــ تا تریاق از عراق آوردہ شود، مار گزیدہ مُردہ شود ــــ والا معاملہ ہے۔ اس کے لئے کوئی (SHORT - CUT) ہونا چاہیئے۔

یہ اعتراض (بظاہر) بڑا وزنی دکھائی دیتا ہے اور میں نے دیکھا ہے کہ اکثر عجلت پسند طبائع اس سے متاثر بھی ہو جاتی ہیں، لیکن مشکل یہ ہے کہ قرآنِ کریم (یا اسوۂ رسولؐ اللہ) سے مجھے کوئی (SHORT CUT) ملتا نہیں۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے، قرآن کے تجویز کردہ راستے کی لمبائی اور رفتار کی (بظاہر) سُستی کا اندازہ اس سے لگ سکتا ہے کہ حضور نبی اکرمؐ کی گراں قدر عمر رسالت کا قریب ساٹھ فیصد حصہ، مکی زندگی کے تبلیغی مرحلہ میں گزرا اور اس کا ماحصل چند سو نفوس سے زیادہ دنیا کے سامنے نہ آیا۔ اس کے بعد مدنی زندگی کا ابتدائی دور بھی

مخالفتوں کے ہجوم کے مقابلہ اور مدافعت میں گزرا۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ اس محنتِ شاقہ سے کاشت کردہ کھیتی کو اپنے سامنے برومند ہوتا دیکھنے کی آرزو خود حضورؐ کے دل میں بھی بیدار ہوتی لیکن بارگاہِ خداوندی سے جواب ملتا کہ اِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِي نَعِدُهُمْ أَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ (۱۳/۴۰) "جو کچھ ان لوگوں سے کہا جاتا ہے اگر اس کا کچھ حصہ تیری زندگی میں سامنے آجائے یا تو اس سے قبل ہی وفات پا جائے، تو اس سے تیرے پروگرام پر کچھ اثر نہیں پڑنا چاہیئے۔ تیرا کام یہ ہے تو اس پیغام کو لوگوں تک پہنچائے چلا جا۔ یہ دیکھنا ہمارا کام ہے کہ ہمارے قانونِ مکافات کی رُو سے اس کے محسوس نتائج کب سامنے آتے ہیں۔" آپ نے غور فرمایا کہ داعیٔ انقلاب کی اس معصوم و حسین آرزو کے باوجود، کوئی چھوٹا متبادل راستہ تجویز نہیں کر دیا گیا۔ "تبلیغ" کا وہی طویل طویل پروگرام برقرار رکھا گیا اور اسی پر مستقل مزاجی سے عمل پیرا رہنے کی تاکید کی گئی۔ جب راستے کی طوالت کو حضور رسالت مآبؐ کے لئے بھی مختصر نہیں کیا گیا تو ہم آپ کس قطار شمار میں ہیں۔ خدا کے مقرر کردہ قوانین اٹل ہیں اور ان میں کسی کی خاطر بھی تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔

لہٰذا، ہمارے لئے دو ہی راستے ہیں۔ اگر ہم نے قرآن کی متعین کردہ منزل تک پہنچنا ہے — یعنی اپنے ہاں قرآنی نظامِ ربوبیت نافذ کرنا ہے تو اس کے لئے پروگرام بھی وہی اختیار کرنا ہوگا جسے قرآن نے تجویز کیا ہے۔ یعنی قلب و نگاہ کی تبدیلی سے "مسلمانِ نامسلمانے" کو مسلمان بنانا، تاکہ وہ نظام اس کے ایمان و اعمالِ صالح کے فطری نتیجہ کے طور پر متشکل ہو سکے۔ اس راستے کو قرآن نے العقبۃ سے تعبیر کیا ہے یعنی پہاڑ کی گھاٹی پر چڑھنا — پہاڑ کی گھاٹی پر تیز قدمی سے چڑھا جا ہی نہیں سکتا۔

ویسے اگر کوئی ہنگامی طور قرآن کے معاشی نظام کو یہاں نافذ کرنا چاہتا ہے، تو اسے حکومت قانوناً نافذ کر سکتی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ مفاد پرست گروہ اسے جبر سے تعبیر کرے گا لیکن قانوناً اسے جبر نہیں کہا جا سکے گا۔ اس لئے کہ جب مسلمان، قرآن پر ایمان رکھنے کا اقرار کرتے ہیں تو قرآن کے کسی حکم کی اطاعت کو وہ جبر کس طرح کہہ سکتے ہیں؟ لیکن یہ محض ایک ہنگامی اور وقتی تدبیر ہوگی۔ اسے نہ دوام و ثبات حاصل ہو سکے گا اور نہ ہی دیانت دارانہ طور پر عمل ہوگا۔ دیانت دارانہ عمل اسی قانون پر ہو سکتا ہے جس کا تقاضا انسان کے دل سے اُبھرے۔ خارج سے وارد کردہ قوانین کی اطاعت طوعاً و کرہاً ہی کی جاتی ہے اور جن لوگوں کے مفاد پر اس سے زد پڑتی ہو، وہ ہر وقت اس سے گریز کی راہیں تلاش کرنے یا تراشنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ اسے دوام و ثبات اسی صورت میں حاصل ہو سکے گا جب یہ اس قوم کے ہاتھوں متشکل ہو جس کے قلب و دماغ میں وہ تبدیلی آچکی ہو جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے اور اس کے ساتھ ہی وہ اس کا بھی انتظام رکھے کہ ان آنے والی نسلوں کی ذہنیت بھی قرآنی سانچوں میں ڈھلتی رہے (جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں) قرآنی نظامِ ربوبیت کی بنیادی اینٹ یہ ہے کہ

ہر شخص اپنی صلاحیتوں کے مطابق، مفوضہ کام کو پوری پوری محنت سے سرانجام دے اور اس کے ماحصل میں سے بقدر اپنی ضروریات کے لے کر باقی سب دوسروں کی ضروریات پورا کرنے کے لئے دے دے۔ بلکہ ہنگامی اوقات میں، دوسروں کی ضروریات کو اپنی ضرورت پر ترجیح دے۔

آپ سوچئے کہ ایسا نظام جس کا سنگِ تاسیس یہ ہو، قلب و نگاہ کی تبدیلی کے بغیر کسی صورت میں قائم و دائم رہ سکتا ہے اور قلب و دماغ میں اس قسم کی تبدیلی پیدا کرنے کے لئے تو یقیناً وقت لگے گا اور اس مدت کو ہمیں ہمت اور حوصلہ سے برداشت کرنا پڑے گا۔

لیکن اگر ہم اتنے لمبے وقت کا انتظار نہیں کر سکتے، تو پھر ہمیں قرآنی منزل کو اپنے سامنے رکھنا ہی نہیں چاہیئے۔ سیدھے طور پر اپنی منزل آپ متعین کر لینی چاہیئے اور اس تک پہنچنے کے راستے بھی خود ہی تجویز کر لینے چاہئیں۔ لیکن پھر دیانتداری کا تقاضا ہے کہ ہم اس پر اسلام کا لیبل نہ لگائیں۔ میں نے ملک کے ذمہ دار حضرات سے شروع ہی میں کہا تھا کہ جب وہ اسلام، اسلام پکارتے ہیں تو انہیں چاہیئے کہ پہلے اچھی طرح سمجھ لیں کہ اس سے مراد کیا ہے۔ اس کے بعد وہ فیصلہ کریں کہ کیا اسلام کو نظامِ حیات بنانے کی ہم میں ہمت ہے۔ اگر ہے تو پھر کسی قسم کی مخالفت کی پروا کئے بغیر، اس راستے پر گامزن ہو جایئے۔ لیکن اگر وہ سمجھیں کہ اس قسم کے نظام کا قیام ان کے بس کی بات نہیں، تو وہ کھلے بندوں اس کا اقرار کر کے دیگر اقوامِ عالم کی طرح اپنے ہاں سیکولر نظام رائج کریں۔ اس سے وہ اگرچہ مقامِ مومن تک نہیں پہنچ سکیں گے تو انہیں کم از کم مقامِ آدمیت تو نصیب ہو جائے گا۔ لیکن انہیں، نہ اس نظام کے قیام کی ہمت ہوئی نہ اس اقرار کی جرأت۔ نتیجہ اس کا وہ منافقت ہے جو اب قوم کے بیشتر حصہ کا شعار بن چکی ہے اور جس سے ہم جہنم کے "درکِ اسفل" میں پہنچ چکے ہیں۔

شباشب انقلاب لانے کے متمنی حضرات ذرا اتنا سوچیں کہ ہمارے پیشِ نظر تو قرآنی انقلاب ہے، جو مظہر ہوتا ہے افرادِ قوم کے قلبی اور ذہنی انقلاب کا۔ اگر ہم ان تحریکوں کی تاریخ پر بھی غور کریں جو معاشرہ کی کسی ایک شق میں تبدیلی پیدا کرنے کے لئے وجود میں آئی تھیں تو ہم دیکھیں گے کہ انہیں بھی اپنے نظریات کی تبلیغ اور ان کے مطابق ذہنیتوں میں تبدیلی کے لئے سالہا سال (بلکہ بعض اوقات صدیوں تک) کا عرصہ لگ گیا اور اس کے بعد جا کر کہیں ذرا سی تبدیلی ہو سکی۔ سطح بین نگاہیں ان تحریکوں کا مشاہدہ اس وقت کرتی ہیں جب وہ نظری انقلاب کی طول طویل مسافت طے کر چکنے کے بعد، ظہورِ نتائج کے مرحلہ میں داخل ہو جاتی ہیں، اس لئے وہ سمجھتی ہیں کہ انقلاب شباشب آجاتا ہے۔ یہ ان کی نگاہ کی بھول ہوتی ہے۔ انہیں کیا علم کہ قطرے کو گہر ہونے تک کس کس قسم کے "حلقۂ صد کامِ نہنگ" سے گزرنا پڑتا ہے۔

اک جلنے کے سوا اور کوئی کیا جانے
حالتیں کتنی گزر جاتی ہیں پروانے پر

ان تحریکوں کی نقالی کرنے والے بھی اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور وہ تحریک کی صدیوں پر پھیلی ہوئی نہایت صبر آزما اور ہمت طلب لیکن خاموش و پُرسکوت مسافت سے صرفِ نظر کر کے آغازِ کار اس مرحلہ سے کر دیتے ہیں جہاں اس تحریک کی نمود محسوس پیکروں میں ہوئی تھی۔ نتیجہ اس کا انقلاب نہیں فساد ہوتا ہے ۔ یعنی تخریب بلا تعمیر!

قرآن مستقل اقدار کی رُو سے انقلاب کا پیامبر ہے اور فساد کو بدترین جرم قرار دیتا ہے اور اس قسم کے انقلاب کے لئے وہ دل اور دماغ دونوں کے انقلاب کو شرطِ لاینفک قرار دیتا ہے خواہ اس میں کتنا ہی وقت کیوں نہ لگ جائے۔

اور قرآن کے اسی انقلاب کا میں مبلغ ہوں اور اس کے لئے اُسی کے تجویز کردہ راستہ پر گامزن ۔ جو احباب مجھ سے کسی اور طریق کے متقاضی اور متمنی ہیں، میں ان کی خدمت میں اس سے زیادہ اور کیا عرض کر سکتا ہوں کہ

زما نگاہ طلب، کیمیا چہ می جوئی!

بعض احباب کہتے ہیں کہ جس منزل کی تم نے نشاندہی کی ہے، وہ بھی درست ہے اور اس تک پہنچنے کا جو طریق تم تجویز کرتے ہو ہمیں اس سے بھی اتفاق ہے لیکن تم نے اپنا مخاطب تعلیم یافتہ (INTELLECTUALS) عوام کا طبقہ قرار دے رکھا ہے حالانکہ موجودہ غلط معاشرہ میں سب سے بُری حالت عوام کی ہے، اس لئے تمہیں چاہیئے کہ عوام (MASSES) میں جا کر اپنے پیغام کی تبلیغ کرو۔ انقلاب عوام کے لانے سے آئے گا۔

میں اس وقت اس بحث میں نہیں الجھنا چاہتا کہ قرآنی انقلاب عوام کے لانے سے آتا ہے یا اربابِ فکر و نظر کے قلب و دماغ میں تبدیلی پیدا کرنے سے۔ میں ان حضرات سے، جو سمجھتے ہیں کہ اصل کام کرنے کا میدان عوام کا طبقہ ہے، عرض کروں گا کہ جب بات آپ کے سامنے اس قدر واضح طور پر آچکی ہے تو پھر آپ اُٹھ کر اس کے مطابق کام کیوں نہیں کرتے؟ آپ مجھ سے تقاضا کیوں کرتے ہیں کہ میں اپنا اختیار کردہ پروگرام ترک کر کے، اس پروگرام کو اختیار کروں جسے آپ بہتر قرار دیتے ہیں۔ ایک مامور من اللہ (رسُول) کی تو یہ کیفیت ہوتی ہے کہ اس کی زندگی میں کوئی دوسرا کسی متبادل راستے کو اختیار نہیں کر سکتا لیکن میں تو نہ مامور من اللہ ہوں اور نہ ہی میں نے اس انقلاب آفرینی کا اجارہ لے رکھا ہے۔ میں نے بطیب خاطر، اپنے لئے زندگی کا ایک مشن تجویز کر رکھا ہے اور اسی پر میں گامزن ہوں۔ جو احباب میرے اس مشن کے ساتھ اتفاق کر کے میرے رفیقِ سفر بنتے ہیں، میں ان کی رفاقت کو شکریہ کے ساتھ قبول کرتا ہوں، جنہیں اس سے اختلاف ہوتا ہے، ان سے بصد معذرت عرض کر دیتا ہوں کہ آپ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں اور اپنے لئے جو نسا راستہ بہتر خیال کریں اسے اختیار کر لیں۔ اب آپ سوچئے کہ جو حضرات اس کے باوجود یہ اعتراض کئے جائیں کہ تم ہمارا تجویز کردہ راستہ کیوں اختیار نہیں کرتے، میں انہیں کیا جواب دوں۔ میرا تجربہ تو یہ ہے کہ اس قسم کے اعتراضات وہی

لوگ کرتے ہیں جو خود کوئی تعمیری کام نہیں کر سکتے اور دوسروں کی تنقیص و تنکیر سے اپنے آپ کو اس خود فریبی میں مبتلا رکھتے ہیں کہ ہم بہت بڑا کارنامہ سرانجام دے رہے ہیں۔ کام کرنے والا اگر کسی راستے کو غلط سمجھتا ہے تو اسے چھوڑ کر کسی دوسرے راستے پر گامزن ہو جاتا ہے۔ وہ یہ نہیں کرتا کہ خود ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جائے اور دوسروں کے پروگرام میں نقص نکال کر عمر بھر یہ شکایت کرتا رہے کہ وہ اس کے تجویز کردہ راستے کو کیوں اختیار نہیں کرتے۔

یہ ہے میرا مسلک، جس پر میں کاربند چلا آ رہا ہوں اور کاربند رہنا چاہتا ہوں کیونکہ میں اپنی قرآنی بصیرت کے مطابق اسی کو صحیح سمجھتا ہوں۔

والسلام!

پرویز

تلخیص و ترجمہ: بشیر احمد عابد

شراب نوشی

فَهَلْ اَنْتُمْ مُنْتَهُوْنَ ۝ (۵/۹۱)

امریکہ میں ہر سال ہزاروں نوجوان بچے شراب نوشی سے ہلاک ہو جاتے ہیں

ریڈرز ڈائجسٹ جولائی ۹۳ء کے شمارے میں شراب نوشی کی ہلاکت خیزیوں پر ایک نہایت فکر انگیز مضمون چھپا، جسے یہاں قارئین طلوعِ اسلام کے استفادہ کے لئے پیش کیا جا رہا ہے۔ ہر وہ کام جو نوعِ انسان کے لئے مفید ہو، اسے فروغ دینا اور جو مضر ہو، اس سے منع کرنا، تحریکِ طلوعِ اسلام کا مشن ہے۔ بحیثیت طالب علم قرآنی ہمارا یہ بنیادی فریضہ ہے (عماد الدین) کہ ہم منکرات پر کاری ضرب لگائیں۔ انسان کی نشوونما ارتقاء میں حائل ہر رکاوٹ کو پاش پاش کر دیں اور یوں اسے ذلت و مسکنت کی پستیوں سے کھینچ کر آفاق کی بلندیوں پر بٹھا دیں، جہاں وہ قاموسِ اکبر سے ہدایت حاصل کر کے اس کائنات کی مؤثر و فعال قوت بن جائے۔ شراب کا تو مجھے علم نہیں، لیکن گذشتہ دہائی کے دوران دیگر منشیات کا استعمال جس سرعت سے پھیلا ہے اور ہماری نوجوان نسل جس بُری طرح اس کی لپیٹ میں آئی ہے اس کے پیشِ نظر ایسے مضامین کی اہمیت دوچند ہو جاتی ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں ایسے مسائل پر سنجیدگی سے غور نہیں کیا جاتا۔ ہمارا سوچنے کا انداز جذباتی ہوتا ہے اور ہمارے دلائل فکر انگیزی کی بجائے اشتعال انگیزی کا باعث ہوتے ہیں۔ ہم تحقیق سے کم کام لیتے ہیں اور تحکم سے زیادہ! مسائل کی تہہ تک پہنچنے کی بجائے ہم سرسری جائزہ لے کر حل پیش کر دیتے ہیں جو اکثر اوقات نہ صرف الجھاؤ پیدا کرتے ہیں بلکہ مزید مسائل کا سبب بھی بن جاتے ہیں۔ زیرِ نظر مضمون کو غور سے پڑھیئے۔ آپ اتفاق کریں گے کہ معاشرتی مسائل کا حل کتنی تحقیق اور توجہ کا طالب ہوتا ہے اور آپ کو یہ بھی پتہ چلے گا کہ ترقی یافتہ اقوام کا کیا طریقۂ کار ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ پر یہ حقیقت بھی واضح ہو جائے گی کہ قرآنِ کریم میں شراب اور دیگر نشہ آور ادویات کو کیوں ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ یاد رکھیئے! سائنسی تحقیقات قرآنِ کریم کے احکام کی بہترین شرح ہوتی ہیں۔ عموماً ان احکام کی شرح و تفسیر میں اسلاف کے اقوال اور احادیث وغیرہ پیش کی جاتی ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ عہدِ حاضر کی تحقیقات پر مبنی علمی دلائل قرآنی احکام کی حکمت اور غرض و غایت کو نکھار کر پیش کرتے ہیں۔ ان کی روشنی

ہیں ان احکام کو بہتر طور پر سمجھا اور عمل کیا جا سکتا ہے۔

شراب سے متعلق پہلا حکم قرآنِ کریم کی دوسری سورت البقرہ کی آیت ۲۱۹ میں آیا ہے جہاں اسے "اثیم" قرار دیا گیا ہے۔ ہر وہ چیز جو انسان میں ضعف اور اضمحلال کا باعث بنے اسے "اثیم" کہتے ہیں۔ مومن کی زندگی میں اثم کا کوئی دخل نہیں ہوتا ہے۔ دوسری بار اس کا ذکر سورۃ النساء کی آیت ۴۳ میں آیا ہے۔ یہاں جماعتِ مومنین سے کہا گیا ہے کہ اگر تم میں سے کوئی نشے کی حالت میں ہو تو اسے چاہیئے کہ وہ صلوٰۃ کے اجتماع میں شرکت نہ کرے، تا آنکہ وہ اس قابل ہو جائے کہ وہاں جو کہے سوچ سمجھ کر کہے۔ صلوٰۃ کے اجتماعات اسلامی معاشرے کی اساس ہوتے ہیں۔ ان اجتماعات میں جماعتِ مومنین اپنے درپیش مسائل کا جائزہ لیتی ہے، پالیسیاں مرتب کرتی ہے اور احکام خداوندی کے تابع ان پر عمل کی راہیں تجویز کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ جملہ کاروائی مدہوشی کی حالت میں سرانجام نہیں دی جا سکتی۔ لہٰذا ممانعت کی غرض وغایت از خود واضح ہے۔ تیسری اور آخری بار سورہ المائدہ کی آیت ۹۰ تا ۹۱ میں اس کی حتمی طور پر ممانعت فرما دی۔ کہا۔ شراب تمہارے باہمی تعلقات پر اثر انداز ہوتی ہے۔ یہ تمہارے درمیان عداوت اور بغض کا باعث بنتی ہے، اس کے زیرِ اثر تم قوانینِ خداوندی کا احترام کرنے سے عاجز ہوتے ہو اور یہ صلوٰۃ کے قیام میں زبردست رکاوٹ ہے۔ صلوٰۃ کا قیام مومن کی زندگی کا نصب العین ہے۔ اس لئے کہ یہی وہ معاشرتی نظام ہے جو انسانی شرف وعظمت کا نگہبان اور ضامن ہے۔ کہا۔ کیا اس کے باوجود تم شراب کے استعمال سے باز نہیں آؤ گے!

زیرِ بحث مضمون میں آپ دیکھیں گے کہ قرآنِ کریم کا یہ حکم کس خوبصورتی سے نکھر کر سامنے آگیا ہے۔ اب پہلے ایک نظر یہ مضمون دیکھ لیں۔ اس پر مزید گفتگو بعد میں ہوگی۔

مضمون نگار اپنے نقطۂ نظر کو واضح کرنے کے لئے پہلی مثال ایک ایسی سولہ سالہ لڑکی کی دیتا ہے جو بڑی خوش خلق دوسروں کے کام آنے والی، دوسروں کے مسائل حل کرنے والی، انہیں مشکلات سے نکالنے میں معاون بننے والی لڑکی ہے۔

اپنے سولہویں یومِ پیدائش پر آزادی کی فضا میں دوستوں کے درمیان پہلی دفعہ کسی کے کہنے پر شراب کا ایک جام لے لیتی ہے، پھر اس کے زیرِ اثر دوستوں کے درمیان خود کو بھول کر اتنی چڑھا لیتی ہے کہ پولیس کے مطابق کم از کم ایک لیٹر بنتی ہے۔

اس پر مستزاد یہ کہ ایک دوست اسے ایک واڈکا (روسی شراب) کا جام یہ کہہ کر پلاتا ہے کہ شروع میں معدہ جلے گا ــــ اس جلن کا علاج مزید وڈکا ہوتا ہے، اس طرح سے آدھی بوتل وڈکا پی کر وہ گھر پہنچنے تک اتنی بدحال ہو جاتی کہ اسے ہوش نہیں ہوتا، گھر والے جب اسے جگانے کی کوشش کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ تو کب کی دنیا چھوڑ چکی ــــ

ڈاکٹروں کے مطابق شراب اس کے خون میں سرایت کر گئی اور رگوں سے ہوتی ہوئی دماغ کے ان حصّوں تک پہنچ گئی جہاں سانس اور حرکت کو کنٹرول کرنے کے مراکز ہوتے ہیں، شراب نے انہیں بند کر دیا تھا۔

اس طرح کیٹی کا نام بھی ان ہزاروں نوجوان بچّوں کی فہرست میں شامل ہو گیا جو ہر سال مے نوشی کا شکار ہو کر موت کی آغوش میں پہنچ جاتے ہیں۔ "ہم نے نشہ آور ادویات کے خلاف تو ایک طوفان برپا کر رکھا ہے۔" لیکن ڈاکٹر مائیک گمبل ڈائریکٹر برائے انسدادِ منشیات 'میری لینڈ' کہتے ہیں۔ شراب کی تباہ کاریوں پر کوئی توجہ نہیں دیتا، ہم نے اسے بھلا رکھا ہے! نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ڈرگ ابیوز (NIDA) کی رپورٹ کے مطابق صحیح صورتِ حال یہ ہے کہ امریکہ میں منشیات کا استعمال اتنا زیادہ نہیں، جتنی مے نوشی ہوتی ہے۔ درجہ ذیل حقائق ثابت کرتے ہیں کہ مسئلہ کس قدر بھیانک ہے!

۱۔ شراب اور منشیات سے متعلق نیشنل کونسل کے اعداد و شمار کے مطابق امریکہ میں پندرہ سے بیس سال تک کے چھیالیس لاکھ بچے شراب کی لت میں بُری طرح مبتلا ہیں۔

۲۔ مچیگن یونیورسٹی کی انسٹی ٹیوٹ آف سوشل ریسرچ کے ایک سروے کے مطابق ہائی سکولوں کے ہر دس میں سے نو بچے کسی نہ کسی موقع پر شراب چکھ لیتے ہیں اور ان میں سے آدھے اس کے عادی ہو جاتے ہیں آٹھویں گریڈ کے تقریباً ستر (۷۰) فیصد بچّوں نے شراب چکھی ہوتی ہے۔

۳۔ اگرچہ لڑکے، لڑکیوں کی نسبت زیادہ پیتے ہیں۔ تاہم لڑکیاں چونکہ قد کاٹھ میں کمزور ہوتی ہیں اس لئے تھوڑی سی شراب بھی اثر انداز ہو جاتی ہے۔ علاوہ ازیں لڑکیاں چونکہ شراب کی ہلکی اور میٹھی قسم جیسے شمپین اور وائن، پسند کرتی ہیں، اس لئے انہیں پیتے وقت اندازہ نہیں ہو پاتا کہ وہ کتنی زیادہ پی چکی ہیں۔

۴۔ نیشنل سنٹر آف ہیلتھ سٹیٹسکس (STATISTICS) کے اعداد و شمار میں بتایا گیا ہے کہ امریکہ میں نوجوان بچّوں کی اموات کی بڑی وجہ ٹریفک کے حادثات ہوتے ہیں اور ان میں زیادہ تر حادثات (تقریباً ہر سال ۳۴۰۰) شراب پی کر ڈرائیو کرنے سے ہوتے ہیں۔ سینکڑوں دوسرے بچّے شراب سے وابستہ دیگر حادثات مثلاً ڈوب جانا، گر جانا، آگ لگ جانا وغیرہ کا شکار ہو کر مر جاتے ہیں۔

ان حقائق کو دیکھ کر سوال پیدا ہوتا ہے کہ بچّوں میں شراب نوشی کی اس کثرت کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ کہا جاتا ہے، کہ اس کی سب سے بڑی وجہ صحبت کا اثر (PEER PRESSURE) ہوتا ہے۔ صحبتِ بد تر از بد کند، کے مصداق اکثر بچے دوستی یاری کے نرغے میں آ کر شراب پینا شروع کر دیتے ہیں۔ ڈائریکٹر گمبل کا کہنا ہے کہ ہائی سکولوں میں شراب نوشی اگرچہ ممنوع ہے لیکن عین متوقع ہوتی ہے۔ نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ڈرگ ابیوز (NIDA) کی ایک سٹڈی کے مطابق، ہائی اسکول سینئرز (SENIORS) کی اکثریت اس خیال کی حامی ہوتی ہے کہ ہفتہ بھر میں ایک آدھ پارٹی لینا

کوئی حرج نہیں۔ "لگے دم! مٹے غم!" ہمارے ہاں جیسے چرسی، بھنگیوں کا نعرہ ہوتا ہے، وہاں بھی زندگی سے بیزاری اور اکتاہٹ کا اظہار یوں ہی کیا جاتا ہے۔ ان حرکات سے اچھے بچے بھی متاثر ہو جاتے ہیں۔ مارک ہائنز نہایت قابل بچہ تھا ہائی سکول میں ایوارڈ یافتہ، نیویارک پولی ٹیکنیک میں انجنیئر سال اوّل کے دوران اس کا تعلیمی گراف گرنا شروع ہو گیا اور اس کی وجہ شراب کی محفلیں تھیں۔ ۳۰ مارچ ۱۹۸۶ء کو وہ اور اس کا ایک دوست مے نوشی کی ایک ایسی محفل سے لوٹ رہے تھے کہ راستے میں گاڑی کا ایکسیڈنٹ کر لیا۔ دونوں کا خاتمہ ہو گیا!

دوستی یاری کے زیرِ اثر (PEER PRESSURE) پینے پلانے میں جوانی کی مستیوں کا بھی دخل ہوتا ہے، گھریلو ماحول کا بھی۔ جہاں گھر میں شراب کا استعمال معمول کا واقعہ ہو، نوجوان بھی متاثر ہوتے ہیں۔ ایک بارہ سالہ لڑکی کا کہنا ہے کہ "کہ میں گھر میں رکھی بوتلوں کو چاٹا کرتی تھی"۔ اس کا کہنا ہے۔ تیرہ سال تک میں اچھی خاصی شرابی بن چکی تھی اور حالت یہ ہو چکی تھی کہ ایک آدھ پیگ پینے کے لئے کبھی کبھی دوستوں کے ساتھ کلاس سے بھی غائب ہو جاتی تھی شراب زندگی کا اوڑھنا بچھونا بن چکی تھی۔ اس کے بغیر سکون ہی نہیں ملتا تھا۔ معاملہ روز بروز بگڑتا گیا۔ میں مکمل عادی ہو چکی تھی۔ میں نے اسے ترک کرنے کی بہت کوشش کی۔ لیکن اب بات میرے بس سے باہر تھی۔ لہٰذا میں نے اس بارے میں سوچنا ہی چھوڑ دیا۔

ڈاکٹر سٹیوارٹ کوپان جو کہ ریاست ورمونٹ میں انسدادِ منشیات کے ڈائریکٹر ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ بہت سے بچے ڈیپریشن (DEPRESION) کی وجہ سے بھی شراب کے عادی ہو جاتے ہیں۔ ان بچوں میں ڈیپریشن کی کئی وجوہات ہوتی ہیں۔ لیکن اس میں معاشرتی اور سکول کی زندگی سے وابستہ پریشانی اور تفکرات کا عنصر غالب ہوتا ہے۔ ان بچوں کی رائے میں انسان شراب پی کر ایک لمحے کے لئے سب کچھ بھول جاتا ہے۔ اس سے سکون ملتا ہے۔ حالانکہ حقیقت اس کے الٹ ہے۔ "یہ چند لمحوں کا سکون بعض اوقات دائمی روگ بن جاتا ہے۔ ڈاکٹر کوپان کا کہنا ہے شراب ہر اس ڈیپریشنٹ (DEPRESANT) کی طرح ہے جس کا نشہ اترتے ہی جسم ٹوٹنا شروع ہو جاتا ہے اور جب تک اسے دوبارہ استعمال نہ کیا جائے تکلیف میں کمی نہیں ہوتی اور یوں یہ ایک ناقابلِ اصلاح عادت بن جاتی ہے۔

بعض اوقات شراب نوشی کی عادتیں والدین سے ورثہ میں بھی ملتی ہے۔ سائنسی تحقیقات سے کچھ شواہد ایسے سامنے آئے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ شراب نوشی کا تعلق جینیٹکس (GENETICS) سے بھی ہے۔ یعنی یہ عادت نسل در نسل منتقل ہو سکتی ہے۔ شرابیوں کی اولاد دوسروں کی نسبت شراب نوشی کی زیادہ دلدادہ ہوتی ہے۔ لیکن ضروری نہیں۔ ڈاکٹر کوپان کہتے ہیں۔ یہ عادت کوئی بچہ بھی اختیار کر سکتا ہے۔ جب وہ دیکھتا ہے کہ اس کے والدین پر شراب نوشی کا کچھ اثر نہیں ہوتا، تو وہ بھی پینا شروع کر دیتا ہے۔ اگر والدین نہ پئیں تو غالب امکان ہے کہ اولاد بھی نہیں پیئے گی۔

ڈاکٹر ڈیرک مڑ جو کہ یونیورسٹی آف ایوانسٹون میں شعبہ نفسیات کے پروفیسر ہیں، کہتے ہیں کہ اگر والدین میں یہ عادت پختہ ہو چکی ہو کہ رات کو سونے سے پہلے پُرسکون نیند کے لئے بیئر کا ایک جام ضروری ہے تو فطری بات ہے کہ بچے بھی متاثر ہوں گے۔ انہیں بھی یہ پیغام مل جاتا ہے اور پھر وہ بھی بیئر (BEER) کے جام میں سکون تلاش کرتے ہیں۔

مندرجہ بالا وجوہات کے علاوہ شراب نوشی معاشرتی اثرات کے تحت بھی شروع کی جاتی ہے۔ ایک اندازے کے مطابق ٹی وی (TV) پر شراب کے اشتہارات جس کثرت سے دکھائے جاتے ہیں اس حساب سے ہر بچہ اکیس سال سے پہلے ہی کم از کم نوّے (۹۰) ہزار شراب نوشی کے مناظر ٹی وی سکرین پر مشاہدہ کرتا ہے۔ اسی طرح بیئر اور وائن سے متعلق ٹی وی کمرشل کو لیجئے۔ ہر سال بچے ہزاروں کی تعداد میں ایسے کمرشل دیکھتے ہیں جن میں ان چیزوں کو لذت اندوزی کا لازمی حصہ بنا کر دکھایا جاتا ہے۔ مس ڈورس ریکن جو نیویارک میں قائم ایک ایسی تنظیم کی صدر ہیں جس کا نصب العین ایسے تمام ذرائع کا سدّباب کرنا ہے جو نوجوان نسل کو شراب نوشی کی طرف لے جاتے ہوں۔ آپ کا کہنا ہے: " ہمارے بچے تو، یوں لگتا ہے، جیسے بیئر کمرشل کی دنیا میں رہتے ہیں۔" یہ جو کچھ وہاں دیکھتے ہیں پھر اسے اپنے ہاں حقیقت کا روپ دے لیتے ہیں۔

نقلی زیورات کی طرح شراب کا لطف بھی نقلی ہوتا ہے لیکن اس کا انجام کہیں زیادہ بھیانک اور اندوہناک ہوتا ہے۔ میں اُنیس سال کا تھا، میسوری سے مائیکل ووکر کہتا ہے، میری یہ حسرت ہوتی تھی کہ کب کسی میکدے میں بیٹھ کر شراب کا لطف لوں گا! ایک رات مجھے ایک ایسی جگہ کا پتہ چل گیا جہاں سٹوڈنٹ کے شناختی کارڈ چیک نہیں کئے جاتے تھے۔ میں بہت خوش ہوا، سوچا، اب مزہ آئے گا! میکدے کی مستیوں اور رنگینیوں کا دوستوں پر خوب رعب جماؤں گا۔ اس بدبخت رات کے بقیہ حصّے کا مجھے کچھ یاد نہیں۔ میں پی پلا کر گاڑی سے گھر جا رہا تھا کہ ایکسیڈنٹ ہو گیا اور جب آنکھ کھلی تو اپنے آپ کو ہسپتال کے بستر پر پایا۔ میں ہل جل نہیں سکتا تھا۔ مائیکل اب ۲۴ سال کا ہو چکا ہے۔ کامل اپاہج، ایک بازو بالکل شل، دوسرے میں معمولی سی حرکت، وہیل چیئر اس کا مقدر بن چکی ہے۔ میسوری یونیورسٹی میں جہاں وہ پڑھتا ہے، اپنے چھوٹے چھوٹے کاموں کے لئے دوستوں کا محتاج ہو گیا ہے۔ وہی اس کے کپڑے بدلتے ہیں اور صاف ستھرا رکھتے ہیں۔ " میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کبھی اس حالت کو پہنچوں گا۔" لیکن ایسا ہو گیا۔ اس کا کہنا ہے کہ خدارا اپنے بچوں کو سمجھایئے، شراب پینے سے پہلے شراب کی تباہیوں کا خوب سوچ لیں۔ اپنی اولاد کے اس فعل کا سنجیدگی سے نوٹس لیں۔ بہت سے والدین شراب نوشی کو معمولی مسئلہ سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ڈاکٹر کوپان کہتے ہیں کہ بچوں میں یہ جو شراب نوشی کی عادت پختہ ہو جاتی ہے، تو اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ اپنی اس کمزوری کو تسلیم نہیں کرتے۔

وہ اگرچہ پیتے ہیں لیکن یہ تسلیم نہیں کرتے کہ شراب ان کی عادت بن چکی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پھر والدین بھی اس

طرف خاص توجہ نہیں دیتے اور عموماً لاپرواہی برتتے ہیں۔ حالانکہ والدین کو اولاد پر کڑی نظر رکھنی چاہیئے۔ یوں تو ظاہری علامات مثلاً مدہوشی یا سانس میں شراب کی بو وغیرہ سے ہی پتہ چل جاتا ہے لیکن بعض بچوں میں ایسا نہیں ہوتا۔ اس عادت کا پتہ چلانے کے لئے ان میں مزید علامات تلاش کرنی پڑتی ہیں۔ یہ علامات باریک بینی کا تقاضا کرتی ہیں۔ مثلاً روزمرہ کے معمول میں تبدیلی، رویّے اور سلوک میں تبدیلی، دوستوں میں تبدیلی، تعلیمی کارکردگی میں کمی وغیرہ۔ ڈاکٹر کوپان کی رائے میں جب بچے شراب نوشی کا شکار ہو جاتے ہیں، تو ان میں مذکورہ بالا سب تبدیلیاں رونما ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔

ڈاکٹر پیٹر روجرز جو مینیسی کے شہر شیتانوگا میں ایک میڈیکل سنٹر کے ڈائریکٹر ہیں، ایک اور اہم اصول کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ "اگر آپ کو یونہی شک بھی گزرے کہ آپ کا بچہ شراب پیتا ہے، تو اسے سچ سمجھ لیجئے اور پھر پوری توجہ کے ساتھ اس کا معائنہ کیجئے۔ ڈاکٹر روجرز کہتے ہیں کہ اس کے بعد اگر یہ معلوم ہو جائے کہ بچہ شراب پیتا ہے تو اسے یوں ہی ڈانٹ ڈپٹ مت کیجئے۔ پہلے پیار و محبت سے سمجھائیے۔ اگر بات بنتی دکھائی نہ دے تو پھر تھوڑی مزید سختی کریں۔ ممکن ہے کہ کچھ معمولی پابندیاں عائد کرنے سے بچہ راہ راست پر آجائے۔ مثلاً اس کا جیب خرچ کم کر دیجئے۔ اگر اسے گاڑی کی سہولت حاصل ہے تو اسے واپس لے لیجئے۔ وغیرہ۔ لیکن ڈاکٹر روجرز کے خیال میں جو بچے بری طرح عادی ہو چکے ہوں ان پر ایسی پابندی کا کچھ اثر نہیں ہوتا۔ وہ کسی کی خوشی یا خفگی سے بے نیاز اپنا پینا پلانا جاری رکھتے ہیں۔ گو کہ ان کے تعلقات خراب ہو جاتے ہیں، تعلیمی ریکارڈ خراب ہو جاتا ہے، آئے دن ٹریفک کے چالان ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ان کی شراب نوشی میں کمی نہیں آتی۔ ایسے بچوں کو ماہرانہ مشورے اور علاج کی ضرورت ہوتی ہے۔ علاج کا آغاز انفرادی ہوتا ہے لیکن اس میں والدین سے بھی مشورہ کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح اصلاحی تنظیمیں، جیسے الکوحلک انانیمس (A.A) بھی کافی مددگار ثابت ہو سکتی ہیں۔ اس کے باوجود اگر اصلاح ہوتی دکھائی نہ دے تو پھر باقاعدہ علاج کی طرف توجہ دینی چاہیئے۔ ایسے بچوں کا پہلے ڈے کیئر سنٹرز میں علاج کیا جاتا ہے۔ یعنی دن بھر تو انہیں ہسپتال میں رہنا پڑتا ہے لیکن رات کو گھر چلے جاتے ہیں۔ اگر اب بھی صحت یابی نہ ہو تو پھر انہیں رہائشی ہسپتالوں میں داخل کر لیا جاتا ہے جہاں انہیں کامل صحت یابی تک رہنا پڑتا ہے۔

پورے ملک میں کوششیں ہو رہی ہیں کہ مسئلہ بڑھنے نہ پائے، شروع ہی میں قلعہ قمع کر دیا جائے۔ اس سلسلے میں کئی اصلاحی تنظیمیں قائم ہو چکی ہیں جو قابلِ قدر خدمات سرانجام دے رہی ہیں۔ ایم۔ اے۔ ڈی۔ ڈی، یہ ان ماؤں کی تنظیم ہے جو شراب نوشی کی حالت میں ڈرائیونگ کے خلاف ہیں۔ اس تنظیم کی کاوشوں کی بدولت ملک کی تمام کی تمام پچاس ریاستوں میں ۲۱ سال سے پہلے شراب نوشی ممنوع قرار دے دی گئی ہے۔ اسی طرح کی ایک دوسری تنظیم ایس۔ اے۔ ڈی۔ ڈی ہے۔ یہ طلباء کی تنظیم ہے اور ان کا مشن بھی نشے کی حالت میں ڈرائیونگ سے منع کرنا ہے۔ اب

بہت سارے سکولوں میں اس کی شاخیں قائم ہو چکی ہیں۔ ریاست جارجیا کے شہر لاگرینگ کی صورت حال یہ تھی کہ ہر سال دو، تین بچے ٹریفک حادثات کا شکار ہو جاتے تھے۔ ایس۔ اے۔ ڈی۔ ڈی نے جب سے وہاں کام شروع کیا ہے (تقریباً ۵ سال پہلے) تب سے ایک حادثہ بھی نہیں ہوا۔ ونڈی شرلنگ جو اس تنظیم کے وہاں کے سابقہ صدر ہیں، ان کا کہنا ہے کہ ایس اے ڈی ڈی کی بدولت سٹوڈنٹس میں مثبت رجحانات فروغ پا رہے ہیں اور اب وہ شرابی دوستوں یاروں کے چنگل میں نہیں پھنستے۔ بلکہ ان میں یہ خیال پختہ ہو رہا ہے کہ اچھے بچے کبھی شراب نہیں پیتے۔

لیکن کیٹی لنز مارک ہائنز اور مائیکل روکر کے لئے یہ کام کافی تاخیر سے شروع ہوئے۔ اگر یہ سب کچھ پہلے سے موجود ہوتا تو شاید وہ شراب کے ہاتھوں تباہ نہ ہوتے۔ ان کی نکھرتی جوانیاں بحفاظت پروان چڑھتیں۔ تاہم اب بھی یہ تنظیمیں ہزاروں بچوں کے لئے سود مند ثابت ہو سکتی ہیں۔ وہ اپنی اصلاح کر سکتے ہیں۔ جینل ہنری جس کا ذکر پہلے گذر چکا ہے، شراب نوشی سے تنگ آ چکی تھی۔ لیکن بے بس تھی، اسے اپنے آپ پر بالکل قابو نہ تھا۔ ایک روز تنگ آ کر وہ ماہر نفسیات کے پاس گئی۔ اس نے مشورہ دیا کہ وہ بے تکلف ہو کر اپنے والدین کو سب کچھ بتا دے۔ وہ مسلسل دو سال تک، صبر و استقامت کا دامن تھامے سر توڑ جدوجہد کرتی رہی اور بالآخر کامیاب ہو گئی، اسے اس لعنت سے چھٹکارا مل گیا، اگرچہ اسے ایک نہایت اذیت ناک دور سے گزرنا پڑا۔ لیکن وہ خوش ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ یوں لگتا ہے کہ میں نے شراب ہمیشہ کے لئے ترک کر دی ہے۔ پچھلے دنوں اس نے اپنے سکول کے میگزین کے لئے شراب پر ایک خوبصورت مضمون لکھا جو مقابلے میں اوّل آیا۔ "مجھے فخر ہے کہ میں شراب ترک کر چکی ہوں"، وہ کہتی ہے۔ میں اسے اپنی بہت بڑی کامیابی سمجھتی ہوں۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اب میں ایک مثالی ڈرائیور ہوں۔"

قارئین کرام! شراب کی ہلاکت خیزیاں آپ نے ملاحظہ فرمائیں۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان حقائق کو جان لینے کے بعد بھی شراب نوشی کا کوئی جواز باقی رہ جاتا ہے۔ ہرگز نہیں! قرآنِ کریم نے بھی اسی لئے اسے ممنوع قرار دیا ہے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ جب کسی چیز کی ممانعت وحیٔ خداوندی کرتی ہے تو اس چیز کے اثرات کہیں زیادہ وسیع تباہ کن ہوتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ انسان کا علم محدود ہے، اس کے وسائل محدود ہیں۔ لہٰذا اس کی معلومات بھی محدود ہوتی ہیں۔ یہ کسی چیز کے بھی اچھے بُرے اثرات کا مکمل احاطہ نہیں کر سکتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ انسان کے اپنے فیصلے زیادہ دیرپا ثابت نہیں ہوتے۔ انسان کے علم میں آئے دن اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ جونہی معلومات میں تبدیلی ہوئی، فیصلے از خود بدل جاتے ہیں۔ اس پیدائشی کمزوری کی وجہ سے انسان کو حقیقت کی تلاش میں بڑی سرگردانی کرنی پڑتی ہے۔ صدیاں بیت جاتی ہیں، کئی کئی نسلیں تباہ ہو جاتی ہیں تب بھی گوہرِ مقصود ہاتھ نہیں آتا۔ جبکہ وحیٔ خداوندی یہی کام پلک جھپکتے کر دیتی ہے۔ حقیقت اپنے آپ کو خود آشکارا کر دیتی ہے۔ لیکن بدبختی سے انسانوں کی اکثریت اس سرچشمۂ علم کو

تسلیم نہیں کرتی۔ اس انکار کی بھی الگ وجوہات ہیں۔ بہرحال، اگر حضرتِ انسان وحیٔ خداوندی کی صداقتوں پر ایمان لے آئے تو یقیناً اسے کئی مسائل و مشکلات سے نجات مل جائے گی۔ اس کا بہت سارا قیمتی وقت اور توانائیاں ضائع ہونے سے بچ جائیں گی، اس کے دکھوں اور غموں کی اندھیری رات چھٹ جائے گی اور اس پر مسرتوں اور کامرانیوں کے نئے نئے آفاق روشن ہوں گے۔ اس وقت انسان جن مسائل سے دوچار ہے ان کا تعلق زیادہ تر حیوانی تقاضوں کی تسکین سے ہے۔ جب کہ انسان کو اس پست مقصد کے لئے نہیں پیدا کیا گیا ہے۔ یہ تو فطرت کا وہ انمول ہیرا ہے جس کی چمک دمک سے کائنات کا حسن دوبالا ہوتا ہے۔ فطرت اسے ان رفعتوں سے ہمکنار کرنا چاہتی ہے جہاں یہ خدا کا ساتھی بن کر اس کائنات کی تخلیق و تعمیر اور تکمیل میں اپنا بھرپور کردار ادا کرے۔ اب ذرا زیرِ نظر مضمون پر غور کیجئے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے پورا امریکہ شراب کی بوتل میں ڈوبا جا رہا ہے۔ دانش وروں، مفکروں اور محققوں کا لشکرِ جرار برسرِ پیکار ہے۔ لیکن اس کے باوجود آج تک کوئی ثبت اور دوٹوک فیصلہ نہیں کر پائے۔ اس کے مقابلے میں وحیٔ خداوندی کو لیجئے۔ پہلے دن ہی اپنی مکمل شکل میں دوٹوک فیصلہ سنا دیا۔ کہا۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَ الْمَيْسِرُ وَ الْاَنْصَابُ وَ الْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَ الْبَغْضَآءَ فِى الْخَمْرِ وَ الْمَيْسِرِ وَ يَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَ عَنِ الصَّلٰوةِ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ۝

(۵/۹۰-۹۱)

"ربنا انا امنا فاغفرلنا ذنوبنا وقنا عذاب النار"

YOUR CONTRIBUTION TOWARDS GIFT SCHEME IS STILL AWAITED
PLEASE DO NOT DEPRIVED THOUSANDS OF READERS DEPENDING ON LIBRARIES RECEIVING TOLU-E-ISLAM AT YOUR EXPENSE

علی محمد چدھڑ

سُپریم لاء قرآن یا قرآن و سُنّت

حکومت اور عوام دونوں حلقوں میں آجکل ایک اہم سوال زیرِ غور ہے کہ پاکستان میں کے آئین میں بالادستی کس قانون کو حاصل ہو۔ ایک اخباری اطلاع کے مطابق پتہ چلا ہے کہ حکومت ازخود "قرآن و سنّت" کو سپریم لاء بنانے کے لئے ایک مسوّدہ اسمبلی میں لا رہی ہے اور نفاذِ شریعت کے لئے جو کمیٹی تشکیل ہوئی تھی اس نے آئین میں ترمیم کے ذریعے قرآن و سنّت کی بالادستی کی سفارش بھی کر دی ہے۔ بہرحال اس مسوّدہ کو قانونی شکل اختیار کرنے تک کن کن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ جہاں تک آئینی بالادستی کا تعلق ہے تو اس کے لئے ہمیں پہلے اقتدارِ اعلیٰ کا فیصلہ کرنا پڑے گا۔ اقتدارِ اعلیٰ (SOVEREIGNTY) مملکت کی وہ اتھارٹی ہے جس کا فیصلہ آخری ہو۔ اسلام میں ایسی ہستی صرف خدا کی ذات ہے۔ یعنی "حقِ حکومت (آخری فیصلہ دینے کا حق) صرف خدا کو حاصل ہے" (۱۲/۴۰)۔ خدا نے اس حق میں کسی کو شریک نہیں کرتا" (۱۸/۲۶)۔ اس سے اسے کسی فیصلہ کی جواب دہی کے لئے نہیں کہا جا سکتا۔ یعنی اس سے یہ نہیں پوچھا جا سکتا کہ اس نے فلاں قانون ایسا کیوں بنایا ہے (۲۱/۲۳)۔ خدا کی حکومت کا مطلب ہے اس کے قانون کی حکمرانی۔ یعنی اسلام میں اقتدارِ اعلیٰ خدا کی کتاب کو حاصل ہوتا ہے۔ قرآن خدا کا کلام ہے اور احادیث یا روایات نبی اکرمؐ کا اپنا ارشاد اور دونوں کا فرق بالکل بدیہی اور واضح ہے۔

سپریم کہتے ہیں (HIGHEST IN RANK OR AUTHORITY) کو، تو اس طرح سپریم لاء کا مطلب ہوا کہ ایسا اعلیٰ و برتر قانون جس سے اونچے اختیار والا کوئی دوسرا قانون نہ ہو سکے۔ جیسے سپریم کورٹ کا مطلب ہے، ملک کی سب سے بڑی عدالت جس کے فیصلہ کو کسی دوسری عدالت میں چیلنج نہ کیا جا سکے۔ ظاہر ہے ایسی اساسی حیثیت صرف ایک ذریعۂ قانون کو ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ جب کہ قرآن اور سنّت دو علیحدہ علیحدہ ذرائع ہیں جنہیں ہم "قرآن و سنّت" کی مشترکہ اصطلاح کے تحت دونوں کو سپریم لاء بنانے پر مصر ہیں۔ کیا کسی ملک میں دو سپریم کورٹس ہو سکتی ہیں؟ اگر اس کا جواب نفی میں ہے تو پھر ہمیں اکیلے قرآن کو سپریم لاء بنانے میں کیا اعتراض ہو

سکتا ہے۔ یہاں سوال محض آئین کے ماخذ کا بھی نہیں بلکہ اسلامی آئین میں اُس اساس کا ہے جسے ہم مقننہ طور پر سپریم حیثیت دے سکیں۔ ایسی متفق علیہ صورت سوائے قرآن کے ہمیں اور کہیں نہیں مل سکتی۔ دراصل قرآنِ کریم ہی وہ یقینی کتاب ہے جو حرفاً حرفاً وہی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی نبیٔ اکرمؐ کو دیا اور جسے نبیٔ اکرمؐ نے اُمّت کو دیا۔ قرآن کے متن کے متعلق کسی کو اختلاف نہیں۔ یعنی جب قرآنِ کریم کی کوئی آیت پیش کی جائے، تو کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ قرآن کی آیت نہیں۔ حضورؐ نے سب سے پہلے خود قرآن کا اتباع کیا (۶/۵۰)۔ پھر اپنی جماعت کو حکم دیا کہ "جو اللہ نے تمہاری طرف نازل کیا ہے اس کا اتباع کرو اور اس کے علاوہ دوسرے کارسازوں کا اتباع مت کرو"۔ اس سے ایک تو یہ معلوم ہوا کہ قانون کے لحاظ سے شروع سے ہی قرآن کو مقدم اور سپریم حیثیت حاصل ہے۔ دوسرے حضورؐ کا کوئی عمل بھی خلافِ قرآن نہیں ہو سکتا۔ اور یوں جو قانون یا عمل قرآن کے مطابق ہوگا وہ سنتِ رسولؐ اللہ کے بھی عین مطابق ہوگا۔ اسلام ابد تک ایک مکمل اور آفاقی نظامِ حیات ہے اس کے لئے سپریم لاء وہی ضابطہ ہو سکتا ہے جو ہر لحاظ سے جامع، غیر متبدل، لاریب اور متفق علیہ ہو جو ساری انسانیت کو ایک مرکز اور ایک ہی ملّت کی لڑی میں پرو سکے۔ ایسا ضابطہ سوائے قرآن کے اور کوئی نہیں ہے۔ ایک تو خود اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ دوسرے اس کے نزول کا مقصد ہی یہ ہے کہ تمام بنی نوعِ انسان کے اختلافات مٹا دیئے جائیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

"کیا یہ لوگ قرآن میں غور و تدبّر نہیں کرتے اور اگر یہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت اختلافات پاتے"۔ (۴/۸۲)

"اور ہم نے تجھ پر یہ کتاب صرف اس لئے نازل کی ہے کہ تو ان کے لئے وہ باتیں واضح طور پر بیان کر دے جن میں یہ اختلاف کرتے ہیں۔ یوں یہ قرآن اُن لوگوں کے لئے ہدایت اور رحمت ہے جو اس کی صداقتوں پر ایمان رکھتے ہیں"۔ (۱۶/۶۴)

ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ تاکید کرتے ہیں کہ جس بات میں تمہیں اختلاف ہو اس کے لئے کتاب اللہ کی طرف رجوع کرو۔ تمہیں وہاں سے حتمی فیصلہ مل جائے گا۔ فرمایا کہ

"تم جس بات میں بھی اختلاف کرو تو اس کا فیصلہ اللہ کی طرف سے ہے"۔ (۴۲/۱۰)

ایک دوسری بات جو ہمارے لئے توجّہ طلب ہے یہ ہے کہ اللہ کے فرمان کے مطابق اختلاف خدا کا عذاب ہے۔ اس نے جماعتِ مومنین سے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ

"تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے خدا کی طرف سے واضح ہدایت آجانے کے بعد باہمی تفرقہ اور اختلاف کیا۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے لئے سخت عذاب ہے"۔ (۳/۱۰۵)

ہمارے بعض مہربان دوست جو قرآن وسنّت کے نفاذ میں پیش پیش ہیں، یہ خیال کرتے ہیں کہ قرآن حضورؐ کی سنّت کے بغیر (نعوذ باللہ) مکمل اور کافی نہیں ہے اور اس طرح وہ اکیلا ہماری راہنمائی نہیں کر سکتا ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں ارشادِ خداوندی ہے کہ

"اور ہم نے اس کتاب میں کوئی چیز نہیں چھوڑی (جس کا ذکر نہ کیا ہو)۔" (۶/۳۸)

سورۃ العنکبوت میں فرمایا۔

"کیا ان لوگوں کو یہ بات کافی نہیں ہوئی کہ ہم نے آپؐ پر یہ کتاب نازل فرمائی جو ان کو پڑھ کر سنائی جاتی رہی ہے۔"

کچھ حضرات قرآن کی جامعیت میں بھی کمی محسوس کرتے ہیں۔ ان کے اطمینان کے لئے اللہ فرماتے ہیں۔

"آج سے میں نے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمتیں تمام کر دیں اور میں نے تمہارے واسطے دین اسلام پسند کیا۔" (۵/۳)

یاد رہے کہ یہی وہ کتاب تھی جسے رسول اللہ خود امت کو دے کر گئے تھے۔ حضورؐ نے اپنے حجۃ الوداع کے خطبہ میں فرمایا کہ "میں تم میں ایسی چیز چھوڑ کر جا رہا ہوں کہ اگر تم نے اسے تھامے رکھا تو تم کبھی گمراہ نہیں ہو گے۔ وہ ہے کتاب اللہ۔" (بخاری شریف، باب حجۃ الوداع)

الغرض قرآن کی جامعیت اور بالادستی قرآن کی رُو سے ہی ثابت ہے اور تمام شکوک وشبہات سے بالا۔ دراصل یہی وہ مکمل ضابطہ حیات ہے جس کے نفاذ کے لئے پاکستان حاصل کیا گیا تھا اور جس کے متعلق علامہ اقبالؒ نے ایک دفعہ فرمایا تھا کہ

"نفسِ اسلام قرآنِ مجید میں بہ کمال وتمام آچکا ہے۔ لہٰذا خداوند تعالیٰ کا منشا دریافت کرنے کے لئے ہمیں قرآن سے باہر جانے کی ضرورت نہیں۔" (البیان دسمبر ۱۹۲۹ء)

اب جو ضابطہ مکمل ہے۔ لاریب غیر متبدل اور محفوظ ہے۔ اس کے متعلق یہ کہنا کہ وہ احادیث وروایات کے بغیر سپریم لاء نہیں بن سکتا۔ ہمارے علماء کرام کو زیب نہیں دیتا۔ خدا نے جو کتاب (قرآن) نازل کی ہے، ایک اٹل حقیقت (بالکل) ہے یقینی ہے۔ ریب وشکوک کی حدود سے بالا ہے۔ اس کے علی الرغم ہم سب جانتے ہیں کہ روایات کے مجموعے تیسری صدی ہجری میں مرتب ہوئے اور وہ بھی کسی تحریری مواد کے بغیر پانچ چھ راویوں کی وساطت سے سُن سُنا کر تحریری شکل میں لائے گئے۔ لہٰذا لاکھ عقیدت واحترام کے باوجود ان مجموعوں کی حیثیت بالحق والی نہیں ہو سکتی۔ ان حالات کے باوجود جو لوگ کتاب (قرآن) کو سنّت (روایات) کے ساتھ منسلک کرنا چاہتے ہیں، ان کی خدمت میں گذارش ہے کہ اسلامی مملکت یہ تو کر سکتی ہے کہ معاشرہ کے موجودہ حالات کے پیشِ نظر قرآنی احکام کو بتدریج

تافذ کرے لیکن اسے یہ حق حاصل نہیں کہ وحی اور روایات کے مرکب کا نام اسلامی قوانین رکھ لے۔ قرآن کی رُو سے
ایسا کرنا جُرم ہے اور دنیا و آخرت میں رسوائی کا موجب (۸۶ — ۲/۸۵)۔ یہاں ایک اور غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے۔
قرآنِ کریم نے جگہ جگہ اپنے آپ کو کتاب کہا ہے۔ اس صورت میں (جیساکہ مختلف روایات سے ظاہر ہے کہ)
قرآن منتشر اوراق اور کھجور کے پتوں یا ہڈیوں کے ٹکڑوں پر بکھرے ہوئے الفاظ کا نام نہیں تھا۔ بلکہ ایک مجموعہ کی
شکل میں مرتب کر کے خود حضورؐ اپنی اُمت کو دے گئے تھے۔ قرآن کے متعلق "کتاب المصاحف" میں درج روایات
کے حوالوں سے جو تصورات اور شکوک ابھرے ہیں یا ابھارے گئے ہیں وہ سب خود ساختہ ہیں اور اسلام کا
دامن قطعی طور پر اُن سے بری الذمہ ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

"یقیناً اس (کتاب) کا جمع کرانا اور اس کا پڑھانا ہمارے ذمہ ہے"۔ (۷۵/۱۷)

ایک دوسری جگہ فرمایا۔
"ہم نے اس قرآن کو نازل کیا اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں"۔
تفسیر المنار میں ہے کہ کتاب بمعنی مکتوب ہے۔ یہ ان چیزوں کے لئے ہے جو لکھی جائیں اور ذَالِكَ الْكِتَابُ ۲/۲
کا اشارہ کرنے میں حکمت یہ ہے کہ رسول اللہؐ نے صرف قرآنِ کریم ہی لکھنے کا حکم فرمایا تھا اور اس کے علاوہ اور کچھ
لکھنے کا حکم نہیں تھا۔ صحیح مسلم میں ہے کہ خود نبی اکرمؐ نے فرمایا تھا کہ مجھ سے قرآن کے سوا کچھ نہ لکھو۔ جس نے قرآن کے
علاوہ کوئی میری بات لکھی ہے تو چاہیئے کہ اسے مٹا دے۔ اب سوال یہ ہے کہ جن دو اجزاء (قرآن و حدیث) کے مجموعے
کا نام دین سمجھا جاتا ہے ان میں سے کوئی ظنی تو نہیں اور کیا یہ دونوں اجزاء۔ اللہ اور اس کے رسولؐ نے دین کی حیثیت
سے مسلمانوں کو دیئے تھے۔ قرآن کی حیثیت تو ہم پر واضح ہو گئی کہ وہ حق، یقینی اور خدا اور رسولؐ کی طرف سے عطا کردہ ہے۔
۱۔ لیکن حدیث کا مقام یہ نہیں۔ جو لوگ حدیث کو دین سمجھتے ہیں وہ بھی حتمی طور پر نہیں کہہ سکتے کہ کوئی حدیث واقعی
لفظاً لفظاً قولِ رسولؐ ہے۔ وہ یوں کہ جب وہ کسی حدیث کو بیان کرتے ہیں تو شروع میں قَالَ رسولُ اللہ کہتے
ہیں یعنی رسولؐ نے فرمایا اور حدیث کے آخر میں اَوْ كَمَا قَالَ رَسُوْلُ اللهِ یعنی یوں یا جس طرح رسولؐ نے فرمایا
درج کر دیتے ہیں اور اس طرح ہر حدیث ظنی اور مشکوک ہو جاتی ہے۔ امام مالکؒ یہ آیت پڑھا کرتے تھے۔

اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّمَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِيْنَ۔

یعنی ہم تو صرف گمان کرتے ہیں ہم کو یقین حاصل نہیں۔

۲۔ دوسرے اللہ تعالیٰ نے نہ تو احادیث کو جمع کیا اور نہ ان کے جمع کرنے کا حکم دیا اور نہ ہی ان کی حفاظت کا وعدہ
کیا۔ احادیث نبی اکرمؐ کے اقوال و اعمال کے مجموعے کا نام ہے۔ اگر یہ جزوِ دین تھا تو جس طرح آپؐ نے قرآن
کے ایک ایک لفظ کو لکھوایا۔ زبانی یاد کرایا۔ لوگوں سے سُنا، دہرایا اور ہر طرح سے اطمینان فرما لیا کہ اس کا ایک ایک

لفظ محفوظ کر دیا گیا ہے۔ لیکن احادیث کے متعلق کوئی ایسا اہتمام نہیں فرمایا۔ بلکہ امت کو قرآن کے علاوہ اور کچھ لکھنے سے منع فرمایا۔

۳۔ احادیث کے تمام مجموعے دورِ ملوکیت میں تیسری صدی ہجری میں مرتب ہوئے۔ اگر یہ صحیح ہے (اور شک کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی) تو پھر ان کتب احادیث کی حیثیت تاریخی رہ جاتی ہے یقینی نہیں ہو سکتی۔ جب کہ دین وہی ہو سکتا ہے جو یقینی ہو۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

"اور ان میں سے اکثر لوگ ظن کے سوا کسی اور چیز کا اتباع نہیں کرتے۔ یقیناً ظن، حق کے مقابلہ میں کوئی فائدہ نہیں دے سکتا۔ اللہ خوب واقف ہے کہ یہ کیا کرتے ہیں۔" (۱۰/۳۶)

۴۔ ہم قرآن و سنت کی اصطلاح میں سنت یا حدیث کو قرآن کے ساتھ منسلک اس لئے کرتے ہیں کہ وہ بخاری، مسلم فقہ کی کتب میں موجود ہے۔ لہٰذا غیر متبدل اور یقینی ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے پاس اور کوئی سند نہیں۔ یہ سراسر اسلاف پرستی اور اندھی تقلید کا مظاہرہ ہے جس سے قرآن نے بہر صورت منع فرمایا ہے (۲/۱۷۰)۔ اور جگہ جگہ فکر و تدبر کا حکم دیا ہے۔ جو لوگ ایسا نہیں کرتے ان کے متعلق فرمایا کہ

"وہ دل رکھتے ہیں لیکن اس سے سوچنے سمجھنے کا کام نہیں لیتے، ان کی آنکھیں تو ہیں لیکن دیکھنے کا کام نہیں لیتے، ان کے کان بھی ہوتے ہیں لیکن وہ ان سے سننے کا کام نہیں لیتے۔ یہ بظاہر انسان نظر آتے ہیں لیکن درحقیقت وہ حیوانوں کی مانند ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گزرے۔" (۷/۱۷۹)

۵۔ کتاب اور سنت کو جب ہم "کتاب و سنت" کی اصطلاح سے بریکٹ کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم حق کو ظن کے ساتھ خلط ملط کر دیتے ہیں۔ اس سے ہم نہ صرف حق کے فیوض سے محروم ہو جاتے ہیں۔ بلکہ کچھ عرصہ بعد اس کی پہچان بھی محال ہو جاتی ہے۔ جیسے جب 'دین' 'مذہب' میں بدل جائے تو 'دین و مذہب' حق و قیاس ایک دوسرے میں اس طرح مدغم ہو جاتے ہیں کہ ان کا الگ الگ کرنا تو ایک طرف ان کی شناخت بھی محال ہو جاتی ہے۔ اور پھر جس طرح ایک ہشیار گوالا پانی ملے ہوئے دودھ کو خالص دودھ کہہ کر بیچتا ہے، مذہبی کاروبار کرنے والے 'مذہب' کی جھوٹی متاع کو زرِ خالص بتا کر بیچتے ہیں اور اس کی بڑی بڑی قیمتیں وصول کرتے ہیں۔

۶۔ جو لوگ روایات کی بنیاد پر مروجہ مذہب کو دین بتاتے ہیں اس کی مثال یوں سمجھیں کہ وہ ہمیں دیسی گھی بتا کر دراصل ڈالڈا کھلا رہے ہوتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب ڈالڈے کا استعمال معیوب اور کسرِ شان تھا اور لوگ چھپ چھپا کر کھاتے تھے۔ لیکن اب تو صورت یہ ہے کہ اصلی گھی تو ناپید ہے اور اسے دنیا بھول چکی ہے۔ اب گھی کے نام سے کھاتے تو ہم ڈالڈا ہیں۔ لیکن توقع گھی کے اثرات کی رکھتے ہیں۔ عمل تو مروجہ مذہب کا ہے لیکن اس دین کے عروج

سرفرازیوں کی۔ خدا کے قانون میں عمل و نتائج کا ایسا تضاد نہیں ہو سکتا۔ وہاں پھل کا حصول ہمیشہ بیج کے مطابق ہوتا ہے۔

اب جبکہ قرآن اور سنّت (روایات) کے متعلق چند حقائق ہمارے سامنے آ چکے ہیں تو قدرتی طور پر ذہن میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کتاب و سنّت کی اصطلاح آخر کیسے وجود میں آ گئی۔ اس کا فوری اور یقینی جواب یہ ہے کہ صدر اوّل کے بعد جب خلافت ختم ہو گئی تو امورِ مملکت اور مذہبی معاملات میں ثنویت پیدا ہو گئی۔ دین مذہب میں بدل گیا تو مذہبی علماء نے اپنی ضرورت کے تحت کتاب و سنّت کی اصطلاح وضع کر لی۔ حضورؐ کا دور اس سے خالی رہا۔ اور خلفائے راشدینؓ تک بھی اس کا پتہ نشان نہیں ملتا۔ حضرت عمرؓ کا نعرہ بھی یہی تھا کہ ہمارے لئے خدا کی کتاب کافی ہے۔ علامہ اقبالؒ نے آئینِ پاکستان کے لئے کبھی کتاب و سنّت کی اصطلاح استعمال نہیں کی۔ تحریکِ پاکستان کے دوران قائداعظمؒ کے فرمودات بھی اس اصطلاح سے خالی ہیں۔ علامہ اقبالؒ تو کہا کرتے تھے کہ اسلامی ضابطہ قوانین وہی مرتب کرے گا جو حسبنا کتاب اللہ کے ساتھ روحِ عمرؓ لے کر اٹھے گا۔ قائداعظمؒ نے اپنی تقاریر میں فرمایا تھا کہ ہماری آزادی اور پابندی کی حدود خدا کی کتاب (قرآن) متعین کرتی ہے۔ ان کے نزدیک اتباعِ سنّت نام ہے حضورؐ کی سیرت اور اسوۂ حسنہ کی پیروی کا۔ حضورؐ نے قرآن کی اتباع فرمائی۔ لہٰذا، قرآن کا اتباع ہی رسولؐ اللہ کی سنّت ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ انہی راہ نماؤں کی پیش کردہ تعبیرِ اسلام برِصغیر کے مسلمانوں نے تسلیم کی اور بالآخر مذہبی راہ نماؤں کی مخالفت کے باوجود پاکستان قائم ہو گیا۔ اب ایک چیز ہے دین یعنی قرآن جو ملّتِ اسلامیہ کی وحدت اور مساوات کی علامت ہے جس میں مذہبی پیشوائیت اور فرقوں کی قطعاً گنجائش نہیں۔ دوسری چیز ہے سنّت۔ جو کہ متفق علیہ نہیں اور اصل یہ ہے کہ مذہبی راہ نماؤں کے نزدیک قدرِ مشترک صرف لفظ "سنّت" ہے۔ اس کا مفہوم ہر فرقے کے نزدیک الگ الگ ہے۔ کتاب و سنّت میں کتاب یعنی قرآن تو سب کے لئے متفق علیہ ہے۔ کوئی ابہام نہیں۔ لیکن سنّت کا کوئی ایسا مجموعہ مرتب نہیں ہوا جو سب کے لئے قابلِ قبول ہو۔ اور تو اور ابھی تک سنّت کی تعریف (DEFINITION) پر بھی اتفاق نہیں ہو سکا کہ سنّت کسے کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ قرآن و سنّت کو سپریم لاء بنانے والے ابھی تک اس کا کوئی متفق علیہ مفہوم بھی متعین نہیں کر سکے۔ اب صورت یہ بنی کہ سنّت کسے کہتے ہیں ہمارے علماء کرام باہم متفق نہیں۔ ایسی کوئی کتاب نہیں جس میں سنّتِ رسولؐ اللہ بہ تمام و کمال درج ہو اور جس کا متن تمام مسلمانوں کے نزدیک قرآنِ کریم کی طرح متفق علیہ اور تنقید سے بالا ہو۔ حتّٰی کہ حدیث کا بھی کوئی ایسا مجموعہ نہیں کہ جو تمام مسلمانوں کے نزدیک متفق علیہ ہو۔ یہی وہ حالات تھے جن سے گھبرا کر مولانا مودودی کو یہ اعلان کرنا پڑا کہ

"کتاب و سنّت کی کوئی ایسی تعبیر ممکن نہیں جو پبلک لاز کے معاملہ میں حنفیوں، شیعوں اور اہلِ حدیث کے درمیان متفق علیہ ہو۔" (ایشیا بابت ۲۳ اگست ۱۹۷۰ء)

بعد میں اسی شکل کی بنا پر انہوں نے ۱۹۷۱ء کی متفقہ قرارداد کے برعکس ملک میں فقہ حنفیہ کے نفاذ کا مشورہ دے دیا۔ اور اسی مشورہ کی تائید میں پچھلے دنوں جماعت اسلامی کے ایک امیر قاضی حسین احمد صاحب نے بھی کہا کہ ملک میں فقہ حنفیہ نافذ کر دی جائے۔ (روزنامہ پاکستان مورخہ ۹۲/۶/۴)۔ بالکل ایسی ہی تجویز ڈاکٹر اسرار احمد صاحب بھی ملتِ اسلامیہ کو پیش کر چکے ہیں۔ (ملاحظہ ہو ان کا بیان مورخہ ۹۲/۲/۱۲ نوائے وقت)۔ اب مذہبی علماء کے مشوروں اور تجاویز کی روشنی میں پرسنل لاز تو درکنار کتاب و سنت کی رُو سے پبلک لاز بھی مرتب نہیں ہو سکتے جو ہر مسلک کے لئے قابلِ قبول ہوں۔ لہٰذا فقہ حنفیہ کا نفاذ ایک مجبوری امر ہے۔ لیکن یہاں بھی ایک مجبوری ہے کہ اہلِ حدیث اور شیعہ حضرات کے لئے قطعاً یہ قابلِ قبول نہیں کہ محض اکثریت کی بنا پر کسی دوسری فقہ کو ترجیح دی جائے۔ یاد رہے کہ شیعہ حضرات کی حدیث و فقہ کے اپنے مجموعے ہیں جو خاص ان کے اپنے ذرائع سے نقل ہوئے۔ یہ انہی کو مستند مانتے ہیں۔ یہ لوگ ان کتب و احادیث کو کوئی وزن نہیں دیتے جو دوسرے فرقوں کے ہاں معتبر ہیں۔ بہرحال کتاب و سنت کی ناممکن العمل اصطلاح کے نام سے جو بھانت بھانت کی آوازیں آ رہی ہیں انہیں مقاصدِ پاکستان سے زیادہ اپنے مفاد عزیز ہیں۔ فقہ کو مملکت کا قانون قرار دینے سے قانون سازی کا سارا اختیار مذہبی پیشوائیت کے ہاتھ میں چلا جاتا ہے۔ لیکن قرآن کی حکمرانی سے ان حضرات کا وجود ہی ختم ہو جاتا ہے۔ لہٰذا وہ صدرِ اوّل کے نظام سے خوف زدہ ہیں اور اسلام کی آڑ میں شاہنشاہیت کا نظام زندہ رکھنا چاہتے ہیں۔ جنرل ضیاء الحق جیسے فوجی ڈکٹیٹر نے اپنے گیارہ سال کے دور میں اسلامی نظام کو جس طرح نظر انداز بلکہ پامال کیا اس کی نظیر کم ہی ملتی ہے۔ لیکن جماعت اسلامی کے اس وقت کے امیر نے ان کی حمایت کرتے ہوئے کہا کہ "وہ ایک فوجی ڈکٹیٹر ہے تو کیا ہوا اسلام تو نافذ کر رہا ہے"۔ جماعت اسلامی پاکستان کی سب سے بڑی اور روشن خیال مذہبی جماعت ہے۔ اسی جماعت کے ایک سابقہ امیر نے ایک تقریب میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ

> "سعودی عرب کے علاوہ کسی جگہ بھی مکمل اسلامی نظام نافذ نہیں۔ سعودی عرب میں بھی بادشاہت ہے لیکن وہاں دیوانی اور فوجداری مقدمات کے سلسلہ میں شرعی قوانین نافذ ہیں۔"
>
> (جنگ لاہور مورخہ ۹۲/ستمبر ۱۶)

ملاحظہ فرمایا آپ نے کتاب و سنت کے حامیوں کا تصورِ اسلام۔ یعنی ان کے خیال میں ایک شاہنشاہ اور ڈکٹیٹر کا اسلام بھی مکمل اسلام ہے۔ لہٰذا انہیں قبول ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے نگاہیں کسی سرسیدؒ کسی اقبالؒ اور کسی جناحؒ کی تلاش میں نکلتی ہیں۔ لیکن بصد حسرت و یاس ناکام لوٹ آتی ہیں۔ اندازہ لگائیں۔ جب ہم اسی قسم کے اسلام کے نفاذ کے سلسلہ میں مختلف فقہیں اور شریعتیں تجویز کریں گے تو خدا جانے کتنے فتنے اُٹھ کھڑے ہوں گے۔ اپنے موجودہ حالات ہی کو لے لیں، ان فرقہ پرستوں کے (بزعم خویش) جہاد اور حقیقت میں فی سبیل اللہ فساد کی وجہ کتنے

عالمِ دین فرمان ہو چکے ہیں اور ابھی سلسلہ جاری ہے دورِ ملوکیت میں تھیاکریسی نے ہلاکو خاں کو آواز دی تھی۔ مملکتِ خداداد میں پتہ نہیں یہ کیا گل کھلائی ہے۔ سیلاب جب آتا ہے تو اونچ نیچ نہیں دیکھتا۔ فتنہ اٹھتا ہے تو انہیں تک محدود نہیں رہتا جنہوں نے ظلم کی روش اپنا رکھی تھی۔ وہ سب کو لپیٹ میں لے لیتا ہے قانونِ مکافات کا مواخذہ بڑا سخت ہوتا ہے۔

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف

جب فقہی احکام کو غیر متبدل قرار دے کر مملکت کے بنیادی قوانین کی حیثیت سے نافذ کیا جائے تو اس اندازِ حکومت کو تھیاکریسی کہا جاتا ہے۔ علامہ اقبالؒ ایسی ہی تھیاکریسی سے دین کو پاک کرنا چاہتے تھے۔ یہ وہی عزم ہے جب انہوں نے فرمایا تھا کہ

"تمہارے دین کی یہ عظیم الشان بلند فطری ملاؤں اور فقیہوں کے فرسودہ اوہام میں جکڑی ہوئی ہے اور آزادی چاہتی ہے۔"

علامہ صاحب نے اپنے خطبات اور کلام کے ذریعہ تمام عمر اسی تھیاکریسی کے خلاف جہاد کرتے رہے۔

"اے کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری"

میں اسی جذبہ کا اظہار ہے۔ جہاں تک قرآن کا تعلق ہے وہ اپنے قومی، معاشی، معاشرتی اور روحانی امراض کے لئے نسخۂ کیمیا صرف قرآن کو سمجھتے تھے۔ چنانچہ اپنی ساری عمر کی قرآن فہمی کا نچوڑ انہوں نے اس شعر میں پیش کر دیا کہ

گر تو می خواہی مسلمان زیستن نیست ممکن جز بہ قرآن زیستن

علامہ اقبالؒ کے بعد قائداعظمؒ کا نمبر آتا ہے۔ انہوں نے بھی ملت کی تمام مشکلات کا حل قرآن ہی کو سمجھا۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے طلباء کے ایک سوال پر جواباً فرمایا کہ

"اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں..... اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول و احکام کی حکمرانی ہے۔"

اقبالؒ کی طرح قائداعظمؒ بھی تھیاکریسی کے مخالف تھے۔ فروری ۱۹۴۸ء میں اپنے ایک پیغام میں فرمایا۔

"یہ مسلمہ بات ہے کہ پاکستان میں کسی صورت میں بھی تھیاکریسی رائج نہیں ہوگی۔ جس میں حکومت مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں دے دی جاتی ہے کہ وہ بزعمِ خویش خدائی مشن کو پورا کریں۔"

حالات کی ستم ظریفی ملاحظہ فرمائیں کہ قائد کے پاکستان میں برسرِ اقتدار مسلم لیگی، مذہبی عناصر کے گٹھ جوڑ سے آج وہی گھِسا پِٹا کریسی نافذ کر رہے ہیں جو قائدِ اعظمؒ کے لئے ناقابلِ برداشت تھی۔ قرآنی اصول و احکام پسِ پشت ڈال دیئے گئے ہیں اور دینِ واحد کی جگہ مختلف فقہی مذاہب کے لئے زمین ہموار ہو رہی ہے۔ یاد رکھیں۔ دینِ اسلام محض عقیدے کی بنیاد پر تقلیداً ایسے خود ساختہ مفروضوں پر ایمان نہیں رکھتا۔ وہ ہمیشہ اپنی صداقت کے لئے دلیل و برہان اور تاریخی شہادات پر انحصار کرتا ہے۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ سابقہ اقوام میں ان کی صحیح روش (بذریعہ وحی)، ہی عروج کا باعث ہے اور جب انہوں نے ضابطۂ خداوندی کو نظر انداز کر دیا، تو تباہ ہو گئیں۔ گویا کسی نظام کے حق و باطل کی پرکھ کے لئے نتائج ہی اصل کسوٹی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ

"اے نبیؐ! ان سے کہہ دو کہ حق و باطل کی جانچ کے لئے انتظار کرو۔ نتائج خود بتا دیں گے کہ کون سی راہ درست ہے۔" (۱۱/۱۲۱)

جب کفار نے حضورؐ سے سوال کیا کہ اس کا کیا ثبوت ہے کہ آپؐ خدا کے سچے رسول ہیں۔ تو آپؐ نے اپنی چالیس سالہ زندگی بطورِ دلیل پیش کر دی۔ اور یہ بھی ایک تاریخی شہادت ہے کہ قرآنِ خالص پر عمل کا نتیجہ صدرِ اوّل کے سنہری اور مثالی دور کی شکل میں ظاہر ہوا۔ اور یہ ایسا قانون ہے کہ اگر اب بھی اس پر عمل ہو، تو نتائج لازماً وہی ہوں گے جو چودہ سو سال قبل ظہور میں آئے تھے۔ اور یہ بھی عبرت آموز ہے کہ جب خدا کی کتاب سے بے رُخی برت کر گریز کی راہیں نکالی گئیں، تو نہ صرف دین ختم ہو گیا۔ بلکہ امتِ مسلمہ بھی انتشار، غلامی اور غربت کا شکار ہو گئی۔ ذہن میں سوال اُبھرتا ہے کہ ہم ان تاریخی نوشتوں سے سبق کیوں نہیں لیتے۔ مروجہ مذہب کی جگہ دین اختیار کیوں نہیں کرتے۔ ہماری کونسی مجبوری ہے کہ ہم اتنی ذلالتوں کے باوجود آج بھی صدرِ اوّل کی خلافت پر آمریت اور فقہی نظام کو ترجیح دے رہے ہیں۔ جب خدا کی طرف لے جانے والا راستہ (قرآن) موجود ہے تو ہم اُسے اختیار کیوں نہیں کرتے۔ ہمارے ذرا غور کرنے پر ان تمام سوالات کا جواب خدا کے ان الفاظ میں مل جاتا ہے۔

"وہ (علماء و مشائخ) لوگوں کی محنت کی کمائی ناجائز طور پر کھا جاتے ہیں اور خدا کی طرف جانے والے راستے میں روک بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔" (۹/۳۴)

انکشاف یہ ہوا کہ ہمارے مذہبی پیشوا ہی ہیں جو اپنے پیٹ اور مفادِ عاجلہ کی خاطر دین کے راستہ (قرآن) کے لئے رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔ یہی پیشوائیت ہے جو قرآن کو نظر انداز کر کے روایات کے سہارے زندہ ہے اور سادہ لوح مسلمانوں کا خون جونک کی طرح چوس رہی ہے۔ دین کی شاہراہ پر چلنا چاہیں تو ہمارا رُخ مذہب کی بے شمار پگڈنڈیوں کی جانب موڑ دیتی ہے۔ قرآن مانگیں تو یہی مولانا حضرات مثلہٗ معہٗ پیش کر دیتے ہیں۔ وحی کا متبادل انہوں نے وحیِ خفی کی صورت میں تلاش کر لیا ہے۔ اور نبی کے مراتب وصی کو بخش دیئے ہیں۔ الغرض ان تمام حیلہ سازیوں کو اس خوبصورتی سے آگے بڑھایا ہے

کہ ہم دین کے بنیادی تصور سے ہی محروم ہو گئے ہیں۔
اور آخر میں مملکت کے مقتدر حضرات، سینٹ اور قومی اسمبلی کے ارکان کی خدمت میں ایک مختصر سی گذارش۔
آج نفاذِ اسلام کے سلسلہ میں سارے عالمِ اسلام بلکہ تمام دنیا کی نظریں آپ پر لگی ہوئی ہیں کہ آپ دین اور مذہب میں سے کس کا انتخاب کرتے ہیں۔ انسان فانی ہے اور اقتدار خدا کی امانت، لیکن حق اور سچ کے فیصلے ہمیشہ پائیدار اور انقلابی ہوتے ہیں۔ اس وقت کا کوئی غلط فیصلہ ہمیں صدیوں پیچھے لے جا سکتا ہے۔ آپ نے صدرِ اوّل اور آمریت کے فقہی نظام میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہے۔ لیکن یاد رہے کہ خدا نے حضورؐ کو بھی یہی حکم دیا تھا کہ

"تم لوگوں کے فیصلے کتاب اللہ کے مطابق کیا کرو۔"

جیسا کہ آپ جانتے ہیں۔

"اسلام میں حقِ حکومت صرف خدا کو حاصل ہے۔" (۱۲/۴۰)

اور یہ بھی کہ وہ اپنے اس حقِ حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا (۱۸/۲۶)۔ خواہ نبی ہی کیوں نہ ہو۔ ارشادِ خداوندی ہے کہ

"کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں ـــــ خواہ اسے ضابطۂ قوانین یا اقتدارِ حکومت اور نبوّت بھی کیوں نہ حاصل ہو کہ وہ لوگوں سے کہنا شروع کر دے کہ تم خدا کی نہیں میری محکومی اختیار کرو۔ اسے یہی کہنا چاہیئے کہ تم سب اُس کتاب کی اطاعت کرو جس کی تم دوسروں کو تعلیم دیتے ہو اور جس پر غور و فکر سے تم اس کے معانی کی تہہ تک پہنچتے ہو۔ ربّانی بن جاؤ یعنی خدا کے محکوم۔" (۳/۷۹)

جو لوگ کتاب و سنّت کے لئے اصرار کرتے ہیں ذرا غور فرمائیں کہ اس فرمانِ خداوندی کے بعد قرآن کے سوا کسی دوسرے قانون کو سپریم لا بنانے کی گنجائش رہتی ہے۔ آج مغرب کی ترقی یافتہ دنیا وحی کی تعلیم اور مستقل اقدار کے لئے ترس رہی ہے۔ ان کی بائبل اور تورات و زبور محرّف ہو چکی ہیں اور خدا کی حقیقی وحی قرآن کی صورت میں صرف ہمارے پاس موجود ہے۔ لیکن ہم نے اپنے خود ساختہ (روایات) قوانین کو خدا کے قوانین پر فوقیت دے رکھی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے کہ

"حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں نے خدا کے متعلق صحیح صحیح اندازہ ہی نہیں لگایا اور سمجھا ہی نہیں کہ اس کا مقام کیا ہے۔" (۶/۹۲، ۳۹/۶۷، ۲۲/۷۵)

آجکل مغربی مفکّرین عیسائیت سے بیزار ہیں۔ ان کے تقاضے کیا ہیں اور انہیں کون سا مذہب پورا کر سکتا ہے۔ اوسپنسکی کی زبانی سنئے۔ "جو مذہب سائنس کی تکذیب کرے اور جو سائنس مذہب کی تکذیب کرے وہ دونوں باطل ہیں۔" اب دیکھتے ہیں قرآن ان کے معیار پر کہاں تک صحیح اترتا ہے اور اپنی صداقت کے ثبوت میں کیا کہتا ہے۔

"ہم لوگوں کو خارجی کائنات (سائنس کے انکشافات) اور ان کی داخلی زندگی میں اپنی نشانیاں

دکھاتے جائیں گے تاآنکہ یہ ان پر واضح ہو جائے کہ یہ واقعی حق ہے۔" (۴۱/۵۲)

ایک دوسری جگہ فرمایا کہ

"کائنات کی بستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے خدا نے اسے تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے"

(۴۵/۱۳)

یہ تھا اس بین الاقوامی اور عالمگیر ضابطہ کی صداقت، جامعیت اور ہمہ گیری کا ایک نمونہ۔ ظاہر ہے۔ ایسے ضابطہ کے نفاذ سے جو دین بھی قائم ہوگا، یکساں طور پر تمام انسانیت اس سے استفادہ کر سکے گی۔ بشرطیکہ ہم دنیا کے سامنے روایات کی بجائے کتاب اللہ کا اسلام پیش کریں۔ خیر یہ تو بھی دین اسلام اور قرآن کی بات۔ سائنس کے متعلق مروجہ مذہب کیا کہتا ہے وہ بھی سُن لیں۔ جیسا کہ بیان ہو چکا ہے۔ ہمارے علماء کا عقیدہ یہ ہے کہ اسلام نام ہے اتباعِ سلف کا۔ اس میں نہ قرآن کا دخل ہو سکتا ہے نہ عقل کا کوئی واسطہ۔ چنانچہ کچھ عرصہ پہلے مدینہ یونیورسٹی کے صدر نے اعلان کیا تھا کہ

"زمین ایک جگہ پر قائم ہے اور سورج اس کے گرد چکر لگا رہا ہے۔ اگر کوئی شخص اس کے خلاف تصور کرے تو اسے پھانسی پر لٹکا دینا چاہیئے۔"

لاؤڈ سپیکر کی ایجاد پر دیوبند کے مفتی اعلیٰ مولانا محمد شفیع نے فتویٰ دیا تھا کہ "اس کا استعمال شرعاً ناجائز ہے۔"

اب اگر ترقی پسند دنیا اس قسم کے مروجہ اسلام پر تعصب و بنیاد پرستی کا لیبل لگائے تو بُرا ماننے کا کیا جواز ہے جبکہ اس سے انکار ممکن نہیں کہ ہمارے مذہبی راہنماؤں کا یہی اسلام ہے، جو وہ قرآن و سنت کے ذریعہ رائج کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ حضورؐ کی سنت کے زیادہ معتقد اور شیدائی ہیں بلکہ اس میں ان کی اپنی مصلحتیں ہیں۔ قرآن بنی نوعِ انسان کے لئے کیا چاہتا ہے اور اس کا نفاذ موجودہ دور کا کیوں تقاضا ہے انہیں اس سے کوئی غرض نہیں۔ وہ لوگ صرف یہ چاہتے ہیں کہ جن اسلاف کو انہوں نے اربابٌ من دون اللہ قرار دے رکھا ہے ان کی معبودیت میں فرق نہ آئے اور یہ اس لئے کہ ان کی معبودیت میں خود ان کی بزرگی کا راز پوشیدہ ہے۔

FOR REGULAR READERS THERE MAY NOT BE ANYTHING NEW BUT FOR A NEW READER EVERY WORD OF TOLU-E-ISLAM IS REVOLUTIONARY

تسنیم آصف

مرے ہمنوا!

فکرِ قرآنی سے وابستہ آپ احباب کی یہ جماعت بہت سمٹی ہوئی ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ اس ضمن میں یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ لوگ اس نظام کو کیونکر مانیں گے جس سے بظاہر انہیں گھاٹا یا نقصان نظر آتا ہو۔ قرآن کے نازل ہونے پر اس کے اوّلین مخاطبوں نے بھی اسی بنا پر قرآن کی مخالفت کی تھی لیکن بایں ہمہ، قرآنی نظام غالب آکر رہا مگر قرآن کے مخالفوں کو زیادہ دیر مایوسی کا سامنا نہیں کرنا پڑا کہ بہت جلد زبان سے الفاظِ قرآن کا ورد کرتے ہوئے لیکن معانی سے ناآشنا اور قرآن سے متضاد عمل کرتے ہوئے لوگ آ گئے۔ دشمنانِ قرآن اور شیطان کے لئے یہ بہت خوشی کی بات تھی کہ اُسے انہیں ورغلانے میں زیادہ محنت نہیں کرنا پڑی۔

آج کے دور میں اقبالؒ اور پرویزؒ نے قرآن کے افکار کے مطابق زندگی گزارنے پر زور دیا کیونکہ قرآن کوئی راگ نہیں ہے جسے خوش الحانی سے گا کر خوش ہو لیا جائے بلکہ یہ تو ضابطۂ حیات ہے۔ قرآنی فکر سے وابستہ حضرات کو چاہیئے کہ وہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو یہ بات سمجھنے میں مدد دیں کہ قرآن مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ یہ سمجھانے کے لئے فنِ خطابت ضروری نہیں کیونکہ یہ بے سود کام تو ہمارے مولوی حضرات بخوبی کر رہے ہیں جس کا نتیجہ صفر نکلتا ہے۔ اس کے لئے ہم سب پر لازم ہے کہ ہم اپنی زندگیوں کو قرآنی سانچے میں ڈھالیں تاکہ ہمیں دیکھ کر لوگ تحریک حاصل کریں۔ اسلام کے ابتدائی دور میں مسلمانوں کے اعمال سے متاثر ہو کر ہی غیر مسلم مسلمان ہو جایا کرتے تھے جب کہ آج مسلمانوں کے اعمال دیکھ کر ہماری اپنی اولاد متنفر ہے کہ وہ مسلمانوں کے ہاں پیدا ہوئی۔

قرآنی فکر سے تعلق رکھنے والے لوگوں سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ عام لوگوں سے بہر طور بہتر ہوں گے۔ اگر یہ والدین ہیں تو یہ شفیق اور اولاد کی بہتر تربیت کرنے والے والدین ہونے چاہئیں۔ اگر یہ اولاد ہیں تو وہ سعادت مند اولاد ہو، میاں، بیوی ہوں، بھائی بہن ہوں، دوست رشتے دار، پڑوسی یا جس بھی حیثیت سے ان کا انسانوں سے واسطہ پڑے انہیں اپنی مثال آپ ہونا چاہیئے اور تمام بنی نوع انسان کے لئے ان کا وجود سود مند ہونا چاہیئے۔

افسوس کی بات یہ ہے کہ جب لوگ ایسے لوگوں سے ملتے ہیں جو دعوے دار تو تمسک بالقرآن کے ہوتے ہیں لیکن رویّہ یکسر غیر قرآنی رکھتے ہیں، تو عوام اُن کو بھی ملاؤں کے گروہ کا فرد سمجھتے ہیں۔ میری آپ احباب سے گذارش ہے کہ

لوگوں کو فکرِ قرآنی کی طرف مائل کرنے کے لئے بہت محتاط انداز اختیار کرنا ہوگا۔ کیونکہ ابھی تو کیفیت یہ ہے کہ

ابھی نہ چھیڑ محبت کے گیت اے مطرب
ابھی حیات کا ماحول سازگار نہیں

آپ لوگ یہ بات بخوبی سمجھتے ہیں کہ نماز جو ہم ادا کرتے ہیں اس کی حیثیت تجدیدِ عہد کی ہے۔ اگر عہد ہی بھول چکا ہو تو تجدید کیسی۔ آپ میں سے بیشتر لوگ عام مسلمانوں کو یہی بات سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن خدارا اپنا انداز بدلئے۔ لوگ آپ سے یہ تأثر کیوں لیتے ہیں کہ یہ نماز پڑھنے کے خلاف ہیں۔ یہ نماز کا مذاق اڑاتے ہیں اور پھر خود ہی فتویٰ صادر کر دیتے ہیں کہ پرویز نے نماز پڑھنے کو منع کیا۔

قرآنی فکر سے تعلق رکھنے والے بعض نوجوان احباب معاشرے کی بے اعتدالیوں سے اس درجہ بددل ہیں کہ انہوں نے خود ہی دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر لی ہے۔ اور ابوالعلا مصری، جس نے کہا تھا "میرے باپ نے مجھ پر ظلم کیا کہ میں وجود میں آیا" میں یہ ظلم کسی پر نہیں کرنا چاہتا" کی مانند موقف اختیار کرتے ہیں اور عائلی زندگی سے گریزاں ہیں کہ اس طرح کچھ اور انسان مصیبت میں مبتلا ہو جائیں گے۔ اگر یہ مسائل کا حل ہے تو آیئے اجتماعی خودکشی کے لئے لیتے ہیں۔

محترم پرویز صاحب نے آپ کو قرآن سمجھنے اور اس کے مطابق زندگی گزارنے کا درس دیا ہے نہ کہ زندگی سے مُنہ موڑ لینے کا کہا ہے۔

قرآنی تعلیمات سے واقف ہو کر آپ زندگی کو سنوارنے کی کوشش کیجئے نہ کہ اردگرد پھیلی ہوئی لادینیت کی کیفیت کو دیکھ کر مایوس ہوں۔ ہمارے لئے تو اقبالؒ نے کہا تھا۔

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اُس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

اپنے اردگرد کی غیر قرآنی فضا کو قرآن سے آشنا کرنا ہی تقدیریں بدلنا ہے۔ بابا فرید، داتا صاحب اور دیگر بزرگانِ دین نے یقیناً اپنے کردار کی پاکیزگی اور عالمانہ قدوقامت کے بل پر اسلام کی روشنی پھیلائی ــــ جسے متبعین نے ناقابلِ یقین کشف و کرامات کا نتیجہ قرار دے کر اپنا من چاہا رُخ دے دیا اور ان کے سیرت و کردار کے اُس رُخ کو اوجھل کر دیا جو ظلمت کدے میں روشنی پھیلانے کا باعث ہوا۔

○

ہمیں قرآنی فکر کو آگے بڑھانے کے لئے پختہ عزم اور حوصلہ مندی کی ضرورت ہے۔ ابلیس سے پنجہ آزمائی اتنا آسان کام نہیں جتنا کہ ہمارے اکثر احباب نے سمجھ رکھا ہے۔ غالبؔ کی ہم نوائی میں، میں یہ کہنے پر

مجبور ہوں کہ

مرہم جراحتِ دل کا جزوِ اعظم ریزۂ الماس ہے

اس کے لئے تو خونِ دل میں انگلیاں ڈبوئی ہوں گی۔ تاآنکہ بقول اقبالؒ۔

آج بھی ہو جو براہیم کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

اک شمع اور بجھ گئی

مبالے یوگنڈا سے فائزہ بیٹی نے اطلاع دی ہے کہ ان کے ابو عبدالخالق خان سروری چودہ جنوری ۹۳ء کو وفات پا گئے۔ مرحوم کا تحریکِ طلوعِ اسلام سے دیرینہ تعلق تھا۔ وہ تحریک کے چلتے پھرتے داعی و سفیر تھے اور قرآنی فکر کو عام کرنے میں سرگرم رہا کرتے تھے۔

سروری مرحوم یوگنڈا یونیورسٹی میں شعبۂ اُردو کے انچارج تھے۔ ان کی دینی اور علمی سرگرمیاں مثالی تھیں۔ وہ اَن تھک کام کرنے والوں میں سے تھے۔ چند سال پہلے انہیں خون کا کینسر ہوا تو بجائے آرام اور حوصلہ ہارنے کے انہوں نے زیادہ جوش اور ولولے سے کام شروع کر دیا۔ اُن کی خدمات اس قدر زیادہ تھیں کہ وفات کے بعد انتظامیہ نے انہیں نہایت عزت و احترام کے ساتھ یونیورسٹی کیمپس میں ہی دفنایا۔ مرحوم نے اپنے پیچھے ایک بیوہ، دو بیٹیاں اور دو بیٹے چھوڑے ہیں۔ ادارہ ان کے غم میں شریک ہے اور مرحوم کے لئے دُعاگو ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمتوں کے سائے میں انہیں رکھے۔

ادارہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

روزہ کے احکام

چونکہ رمضان المبارک کا مہینہ قریب آرہا ہے۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ (معمول کے مطابق)[1] قرآن کی رُو سے روزے کے احکام مختصر الفاظ میں بیان کر دیئے جائیں۔ یہ احکام سورہ بقرہ میں آئے ہیں۔ متعلقہ آیات یہ ہیں:

(۱) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝ (۲/۱۸۳)

"اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! جس طرح تم سے پچھلی قوموں پر روزہ فرض کیا گیا تھا۔ اسی طرح تم پر بھی روزہ فرض کر دیا گیا ہے تاکہ تم قانونِ خداوندی کی نگہداشت کر سکو۔"

(۲) أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ ۚ ——— "یہ روزے چند گنے ہوئے دنوں کے ہیں"

(۳) فَمَن كَانَ مِنكُم مَّرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۚ

"پھر جو کوئی تم میں سے بیمار ہو یا سفر میں ہو تو وہ دوسرے دنوں میں روزے رکھ کر گنتی پوری کر دے"

(۴) وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ ۖ

(۵) اور جو لوگ بدشواری روزہ رکھ سکیں ان کے لئے روزہ کے بجائے ایک مسکین کو کھانا کھلا دینا کافی ہے

(۶) شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ.....

روزے رمضان کے مہینے کے ہیں جس میں قرآن نازل کیا گیا ہے۔

(۷) فَمَن شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۖ وَمَن كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۚ (۲/۱۸۳-۱۸۵)

---

[1] - ان احکام کو ہم اس سے پہلے بھی کئی بار درج کر چکے ہیں لیکن ہم ان کے اعادہ کی ضرورت ہر سال سمجھتے ہیں۔ اسلئے انہیں پھر دہرایا جا رہا ہے

"لہٰذا تم میں سے جو کوئی اس مہینہ میں اپنے گھر پر موجود ہو تو اسے اس مہینے کے روزے رکھنے چاہئیں۔
البتہ اگر تم میں سے کوئی بیمار ہو یا سفر میں ہو ۔۔۔۔۔۔۔ تو وہ دوسرے دنوں سے گنتی پوری کرلے"

(۸) وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۖ ثُمَّ أَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى اللَّيْلِ (۲/۱۸۷)
اور کھاؤ پیو یہاں تک کہ تمہارے لئے صبح کی سفید دھاری سیاہ دھاری سے متمیز ہو جائے۔ پھر رات تک روزہ پورا کرو۔

(۹) أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَائِكُمْ ۚ (۲/۱۸۷)
اور تمہارے لئے روزوں کی راتوں میں اپنی بیویوں سے اختلاط حلال کیا گیا ہے۔

ان آیات سے معلوم ہو گیا کہ:-

۱ روزے رمضان کے مہینے کے ہیں (تین دن یا نو دن کے نہیں بلکہ پورے مہینے کے)
۲ روزے میں، اس وقت سے لے کر جب صبح کی سفیدی نمودار ہو جائے، دن کے ختم ہونے تک کھانا پینا اور بیوی سے اختلاط منع ہے۔
۳ روزے اس کیلئے ہیں کہ جو اس مہینہ میں اپنے گھر پر موجود ہو اور تندرست ہو۔ مریض تندرست ہونے پر اور مسافر سفر سے واپسی پر دوسرے دنوں میں روزے رکھ کر گنتی پوری کر دے۔
۴ اب ایک شکل اور باقی رہ جاتی ہے اور وہ یہ کہ ایک شخص (عام عرفی معنوں میں) نہ تو بیمار ہے اور نہ مسافر ہے لیکن کسی وجہ سے اسے روزے رکھنے دشوار ہیں۔ مثلاً ایک بوڑھا آدمی اپنے گھر پر موجود ہے اور مریض بھی نہیں لیکن بڑھاپے کی وجہ سے کمزور اتنا ہے کہ بمشکل روزہ رکھ سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ رمضان کے بعد دوسرے دنوں میں روزے رکھ کر گنتی پوری کر دے۔ ایسے لوگوں کا حکم آیت نمبر ۴ میں بیان کر دیا گیا ہے کہ جو لوگ ایسے ہوں کہ بمشکل روزہ رکھ سکتے ہیں انہیں اپنے آپ کو دشواری میں ڈالنے کی ضرورت نہیں وہ روزہ کے بجائے ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں۔

غور فرمائیے! اوپر کی چاروں شقوں میں ہر قسم کے حالات جمع ہو گئے ہیں اور یہی احکام کی جامعیت کا تقاضا تھا۔
ہم نے وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ کا ترجمہ ــــ وہ لوگ جو بدشواری روزہ رکھ سکیں ــــ کیا ہے حالانکہ اس کا عام ترجمہ ــــ اور جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہو ــــ کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ترجمہ صحیح نہیں۔ اس لئے کہ اس ترجمہ کی رُو سے مطلب یہ ہوگا کہ جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہوں۔ وہ تو ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں اور جن میں روزہ رکھنے کی طاقت ہی نہ ہو وہ روزے رکھا کریں۔ حالانکہ قرآن کا منشا

یہ نہیں ہوسکتا۔ بات یہ ہے کہ لفظ "طاقت" کا جو مفہوم ہمارے ہاں اردو میں رائج ہے وہ اس سے مختلف ہے جو عربی زبان میں اس کا مفہوم ہوتا ہے۔ ہمارے مترجمین نے عربی کے لفظ 'طاقت' کا ترجمہ اردو کے لفظ "طاقت" سے کردیا۔ ان دونوں زبانوں کے مفہوم میں جو فرق تھا اسے نظر انداز کر گئے۔ عربی زبان میں اس لفظ کا کیا مفہوم ہوتا ہے۔ اس کے لئے عربی زبان کی لغات دیکھئے۔ محیط المحیط جلد دوم ص ۱۳۰۴ میں ہے۔

> طاقت کے معنی کسی چیز پر قدرت رکھنا ہیں۔ لیکن یہ قدرت کی ایسی مقدار کو کہتے ہیں کہ جسے انسان بمشقت کر سکتا ہے۔ دراصل یہ لفظ اس طوق سے ماخوذ ہے جو کسی چیز کو اپنے گھیرے میں لے لیتا ہے۔ لَا تُحَمِّلْنَا مَالَا طَاقَتَ لَنَا بِهٖ کے معنی یہ نہیں کہ جس کی ہمیں قدرت نہ ہو بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ جس کا بجالانا ہمیں دشوار ہو۔

اس طرح عربی کی مشہور لغت لسان العرب ص ۱۰۳ جلد ۱۲ میں ہے کہ

> طاقت قدرت کی اس مقدار کا نام ہے جو کسی انسان کے لئے بمشقت کرنا ممکن ہو۔

مفتی محمد عبدہٗ اپنی تفسیر المنار ص ۱۵۵ جلد ۲ میں فرماتے ہیں۔

> اَلطَّاقَۃُ دراصل مُکْنَتٌ اور قدرت کے بالکل ادنیٰ درجہ کا نام ہے۔ چنانچہ عرب اَطَاقَ الشَّیْءَ صرف اس وقت کہتے ہیں جب اس کی قدرت نہایت ہی ضعیف ہو یعنی بدشواری اسے برداشت کرسکتا ہو۔ چنانچہ یُطِیْقُوْنَہٗ سے مراد بوڑھے، ضعیف اور اپاہج لوگ ہیں جن کے اعذار کے دور ہوجانے کی کوئی توقع نہیں کی جاسکتی۔ اور وہ لوگ ہیں جو ان ہی کی طرح معذور ہیں یعنی ایسے کام کاج کرنے والے لوگ جن کی معاش خدا نے پرمشقت کاموں میں رکھ دی ہے... اسی بنا پر امام راغبؒ نے لکھا ہے کہ طاقت قدرت کی اس مقدار کا نام ہے جس کا کرنا انسان کے لئے بمشقت ممکن ہو۔

اس کی تائید تفسیر کشاف سے بھی ہوتی ہے جس میں لکھا ہے کہ:۔

> طَاقَۃٌ کے مفہوم میں وہ کام آتے ہیں جنہیں بہ تکلیف یا بمشقت کیا جا سکے اور وَعَلَی الَّذِیْنَ یُطِیْقُوْنَہٗ سے مراد بوڑھے مرد اور بوڑھی عورتیں ہیں۔ جن کے لئے روزہ نہ رکھ کر فدیہ دینے کا حکم ہے چنانچہ اسی بناء پر یہ آیت ثابت ہے منسوخ نہیں ہے۔ (تفسیر کشاف ص ۲۵۵ جلد ۱)

تفسیر روح المعانی میں ہے۔

> عربی زبان میں اَلْوُسْعَ کا لفظ اس قدرت کا نام ہے جو سہولت کے ساتھ ہو اور طَاقَۃٌ کا لفظ اس قدرت کا نام ہے جو شدت اور مشقت کے ساتھ ہو۔ لہٰذا (آیۂ زیر نظر) کے

معنی یہ ہوں گے اور ان لوگوں پر جو شدّت اور مشقّت کے ساتھ روزہ رکھ سکتے ہیں ایک مسکین کو کھانا کھلا دینا ہے۔۔۔۔۔ (روح المعانی صہ ۵۹ جلد ۲)

تصریحاتِ بالا سے آپ نے دیکھ لیا کہ عربی زبان میں لفظ "طَاقَۃ" کا مفہوم کیا ہے اور اس بنا پر وَعَلَی الَّذِیْنَ یُطِیْقُوْنَہٗ کا ترجمہ ـــــ اور جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہوں ـــــ کر دینا کس قدر غلط فہمی کا موجب ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے اس کا ترجمہ ـــــ اور جو لوگ بدشواری روزہ رکھ سکیں۔۔۔ کیا ہے۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں قرآن کا اسلوب یہ ہے کہ وہ ایک اصول بیان کر دیتا ہے اور اسے امّت کے اجتماعی نظام پر چھوڑ دیتا ہے کہ وہ اس کی جزئیات خود متعین کر لے۔ چنانچہ عَلَی الَّذِیْنَ یُطِیْقُوْنَہٗ میں بھی یہی اسلوب اجتماعی اختیار کیا گیا ہے۔ یہاں ایک اصول بیان کر دیا گیا ہے اور اس کی تفصیلات خود بیان نہیں کیں (کہ وہ لوگ کون ہیں جو بمشقّت روزہ رکھ سکتے ہیں) اس کی تفاصیل پہلے بھی متعین کی جا چکی ہیں اور ان پر اب بھی غور کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ علامہ قرطبی کی کتاب "جامع احکام القرآن" صہ ۲۶۸-۲۶۹ جلد ۲ میں ہے کہ:

> تمام علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ بوڑھے مرد اور بوڑھی عورتیں جو روزہ رکھنے کی طاقت ہی نہیں رکھتے یا شدید مشقّت کے ساتھ طاقت رکھتے ہیں۔ ان کیلئے روزہ نہ رکھنا جائز ہے مگر اس میں اختلاف ہے کہ ایسے لوگوں کے ذمّے کیا ہے؟ چنانچہ امام ربیعؒ اور امام مالکؒ نے کہا ہے کہ ان کے ذمّے کچھ بھی نہیں ہے۔ البتہ امام مالکؒ نے کہا ہے کہ اگر یہ لوگ روزانہ ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں تو میرے نزدیک یہ پسندیدہ ہے اور حضرت انسؓ۔ ابن عباسؓ، قیس بن السّائب اور ابوہریرہؓ نے فرمایا ہے کہ ان لوگوں کے ذمّہ فدیہ ہے۔ امام شافعیؒ اور اصحاب الرّائے (حنیفہ) امام احمد اور امام اسحٰقؒ کا قول بھی یہی ہے۔ نیز ابن عبّاس کی روایت یہ ہے کہ انہوں نے اپنی امّ ولد سے فرمایا جو حاملہ تھی یا بچّہ کو دودھ پلا رہی تھی کہ تو اُن لوگوں میں سے ہے جو بمشقّت روزے رکھ سکتے ہیں۔ لہٰذا تیرے ذمّے فدیہ ہے قضا نہیں۔

مفتی سید محمد عبدہٗ نے اور بھی اضافہ فرمایا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

> اَلَّذِیْنَ یُطِیْقُوْنَہٗ سے یہاں مراد بوڑھے، ضعیف اور اپاہج لوگ ہیں جن کے اعذار کے دُور ہو جانے کی امید نہیں ہوتی۔ ایسے ہی وہ لوگ بھی ان کے ضمن میں شمار ہونگے جو مزدور پیشہ ہوں جن کی معاش خدا نے پُرمشقّت کاموں میں رکھ دی ہے۔ مثلاً کانوں سے کوئلہ نکالنے والے

اور وہ مجرم جن سے قید خانوں میں مشقّت کے کام لیئے جاتے ہیں اور جن پر روزہ رکھنا گراں ہو..... تیسری قسم کے وہ لوگ ہیں جن پر کسی ایسی وجہ سے جن کے دُور ہو جانے کی کوئی امید نہ ہو۔ روزہ رکھنا گراں گذرتا ہو جیسے بڑھاپا۔ اور پیدائشی کمزوری اور ہمیشہ محنت کے کاموں میں مشغولیت اور پرانی بیماری جس کے اچھا ہونے کی امید نہ ہو۔ ایسے ہی وہ شخص جس کی مشقّت کا سبب ہوتا رہتا ہے جیسے حاملہ عورت اور دودھ پلانے والی عورت۔ ان سب لوگوں کیلئے جائز ہے کہ وہ روزہ کے بجائے ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں۔ اتنا کھانا جو ایک اوسط درجے کی خوراک کے آدمی کا پیٹ بھر سکے۔ (تفسیر المنار صہ۱۵۵ صہ۱۵۷ جلد ۲)

اِن تفاصیل سے حسب ذیل فہرست مرتّب ہو جاتی ہے:

۱　بوڑھا مرد اور بوڑھی عورت
۲　حاملہ عورتیں۔
۳　دودھ پلانے والی عورتیں
۴　اپاہج اور معذور لوگ
۵　پرانی بیماریوں والے جن کے اچھا ہونے کی امید نہ رہے اور وہ ان کی وجہ سے روزہ بمشقّت رکھ سکیں
۶　ایسے کمزور لوگ جو خلقی اور پیدائشی طور پر (CONSTITUTIONAILY) کمزور پیدا ہوئے ہوں
۷　وہ مزدوری پیشہ لوگ جن کی معاش ہمیشہ پُرمشقّت کاموں میں ہوتی ہے مثلاً کانوں میں کام کرنے والے کارخانوں میں کام کرنے والے یا رکشہ چلانے والے۔
۸　وہ مجرم جن سے جیل میں مشقّت کے کام لئے جاتے ہوں۔

یہ فہرست جامع اور مانع نہیں۔ بحالاتِ موجودہ اپنے اپنے حالات کے مطابق اس میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ اصول یہی ہے کہ جو شخص بہ مشقّت روزہ رکھ سکے وہ روزہ نہ رکھے۔

یہ ہیں روزوں کے متعلق مختصر الفاظ میں قرآن کے احکام۔ ان آیات کو آپ خود بھی قرآنِ کریم میں دیکھ لیں۔ (یعنی سورۂ بقرہ آیات ۱۸۳ تا ۱۸۸)

محمد قاسم نوری

اللہ کی ضمانت

یہ تو سمجھ میں آچکا ہے کہ قرآنِ کریم کی تعلیمات و ہدایات ہی ــــ دنیا اور آخرت دونوں میں مثالی زندگی کی ضمانت ہیں لیکن منزل اور راستے کا علم ہی تو سب کچھ نہیں ہوتا۔ قدم اٹھائے بغیر راستہ طے نہیں ہوتا اور راستہ طے کئے بغیر منزل کی آسودگی نصیب نہیں ہو سکتی ــــ جو خوراک جزوِ بدن نہ بنے' لاحاصل ہوتی ہے۔ جس نوٹ کو کیش نہ کرایا جائے' محض کاغذ کا ٹکڑا ہوتا ہے۔ جس بیج کو بویا ہی نہ جائے وہ کبھی درخت نہیں بن سکتا۔ اسی طرح جس علم کو' عمل کی بھٹی سے نہ گزارا جائے وہ کبھی نتیجہ خیز نہیں ہوتا۔ ہزار سال سے ہم صرف باتیں کر رہے ہیں تقریریں سُن رہے ہیں۔ بحثوں پہ بحثیں کرتے چلے جا رہے ہیں اور اسی بات میں مگن ہیں کہ ہمیں منزلِ بہشت کا سراغ مل گیا ہے اور صرف کلمہ پڑھ لینے کی بدولت دونوں جہاں کے خزانے اور اللہ کی تمام نعمتوں کے مالک بن گئے ہیں۔ یہ خوش فہمی نہیں' بہت بڑی خود فریبی ہے۔ جنتی زندگی اور اللہ کی رحمتیں' عمل کرنے والوں کے لئے ہوتی ہیں۔ صرف وعظ و نصیحت اور باتیں کرنے والوں کے لئے نہیں ہوتیں اور عمل کا وقت آیا نہیں کرتا' لایا جاتا ہے۔"

کامیاب زندگی کا سیلبس اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ اللہ کی کتاب پر ایمان لایا جائے اور اس کے احکام و قوانین پر عمل کیا جائے۔ یہی حکمِ الٰہی ہے اور یہی سنّتِ رسولؐ۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ کتاب صرف مسلمانوں کے لئے ہے' حالانکہ اس کا اپنا دعویٰ یہ ہے کہ یہ پوری بنی نوعِ انسان کے لئے نازل کی گئی ہے۔ جس رسول کی نسبت ہم صرف مسلمانوں کی طرف کرتے ہیں اس کے بارے میں بھی اللہ کا کہنا یہ ہے کہ وہ "رحمتہ اللعالمین" ہیں' تو کتاب بھی دنیا کے سارے انسانوں کے لئے ہوئی اور رسولِ محترم صلی اللہ علیہ وسلم بھی سارے انسانوں کے ہادی اور لیڈر قرار پائے ــــ آج اگر دنیا اس ذکرٌ للعالمین سے بے خبر ہے' اس رحمت اللعالمین سے ناواقف ہے اور تاریکیوں میں بھٹک رہی ہے تو اس کی وجہ ہماری اپنی کوتاہی ہے جو خود کو اس کتاب کے وارث اور ماننے کا دعویٰ کرتے ہیں' حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد یہ اس امت کا فریضہ تھا کہ اس نورِ مبین سے دنیا کو مستفید کرتی ــــ ہم نہ صرف زبانی طور پر بلکہ اس اسوۂ حسنہ کو سامنے رکھ کر اپنی زندگیوں

کو اس سانچے میں ڈھال کر دنیا کے سامنے امن و سلامتی کے ساتھ ہی ترقی اور سربلندی کی مثال بنتے ــــ برخلاف اس کے ہم نے تو اس رہبرِ اعظم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو بھی دوسرے مذاہب کے لانے والے کی طرف "پروفٹ" کہنا شروع کر دیا۔ یعنی پیشگوئیاں کرنے والا اور ان کی تقلید میں بڑے فخر سے ہادیٔ اعظم، خیر الامم ــــ رحمۃ اللعالمین کو ہم بھی پروفٹ کہنے لگے۔

قرآن ہر اس شخص کے لئے ہے جو اسے اپنانا چاہتا ہے، اس پر عمل کرنا چاہتا ہے، جسے اس پر ایمان نہیں لانا اور عمل نہیں کرنا ــــ وہ کرتا رہے جو کر رہا ہے ــــ کچھ فرق نہیں پڑتا۔ اس کے لئے سود بھی حلال ہے اور سود بھی حلال ہے ــــ زمینداری اور جاگیرداری بھی جائز ہے۔ دوکانوں، مکانوں اور بلڈنگوں کے کرائے بھی جائز ہیں اور فرقے اور طبقے بھی جائز ہیں۔ ان کے لئے نہ اخلاق کی پابندی ہے نہ کردار کی قید۔ ان کے لئے نہ اللہ ہے اور نہ رسول ہے اور نہ دین و اسلام ہے۔ میرا یہ تخاطب صرف اور صرف ان کے لئے ہے جو قرآن پر ایمان لانا چاہتے ہیں اور اُسی کے مطابق اپنی زندگیاں گزارنا چاہتے ہیں۔

عجیب بات ہے ہم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو اس کا اقرار کرے کہ وہ قرآن پر ایمان نہیں رکھتا، یا اس کے مطابق زندگی گزارنا نہیں چاہتا لیکن دلوں کو ٹٹولئے تو ایک خوف، قرآن کی طرف آنے میں سب کو لاحق ہے کہ اس معاشرہ اور سودی نظام میں، کافرانہ رسم و رواج، فرقوں اور طبقوں میں بٹی ہوئی اس سوسائٹی میں جہاں جھوٹ بولے بغیر سچ کو بھی تسلیم نہیں کیا جاتا ــــ رشوت کے بغیر انصاف بھی نہیں ملتا۔ فریب اور دھوکا دہی کے بغیر کوئی بزنس نہیں کیا جا سکتا۔ ریاکاری، عیاری اور مکاری کے بغیر خود کو نہیں منوایا جا سکتا۔ جہاں دولت ہی شرافت کا معیار ہے، عزت کا سمبل ہے وہاں قرآنی ہدایتوں اور ضابطوں کی پابندی کے ساتھ کیسے زندہ رہا جا سکتا ہے؟

سوچیئے! اس خوف کی وجہ کیا ہے؟ اس کی وجہ صرف ایک ہے کہ اللہ، ہمارے نزدیک، ناقابلِ اعتبار ہو گیا ہے۔ ہمیں یہودی ذہن اور نظام کی پیداوار بنکوں پر بھروسہ ہے۔ کروڑوں روپے دے کر کاغذ کی دس چٹوں پر مشتمل چھوٹی سی ایک چیک بک لے کر گھر آجاتے ہیں اور ایک پل کے لئے بھی گمان نہیں گزرتا کہ روپے ڈوب جائیں گے ــــ پندرہ بیس لاکھ روپے کی مشینری، ورکشاپ میں ایک اجنبی جاہل اور ناواقف مکینک کے سپرد کر آئیں گے اور یقین ہو گا کہ وہ اسے درست کر کے واپس بھی کر دے گا۔ بزنس میں کروڑوں کا بیوپار صرف زبانی سودوں پر کر لیں گے۔ دوستوں پر اعتماد ہو گا کہ وقت پڑنے پر وہ مدد کے لئے دوڑ پڑیں گے لیکن اللہ ہزار ضمانتیں دے، رسولؐ لاکھ یقین دلائے ہمیں خوف، تذبذب اور خطرہ ہی لاحق رہے گا ــــ ہم یقین ہی نہیں رکھیں گے کہ اللہ کی اطاعت اور اس کے قوانین کی پیروی سے وہی نتائج نکلیں گے جو اللہ بتا رہا ہے۔ ان کے اتباع سے نہ

کوئی خوف رہے گا نہ حزن بلکہ آخرت کے خزانے تو ایک طرف کہ وہ بعد کی بات ہے، دنیا میں بھی غلبہ حاصل ہو جائے گا بلکہ دنیا ہی کو ایک مومن کے لئے جنت بنا دیا جائے گا۔

تو اللہ پر یقین، بھروسہ اور اعتماد ہی وہ بنیاد ہے جو کھو گئی ہے۔ سب سے پہلے اسے ڈھونڈنا ہے، اسے واپس لانا ہے، یہ نہیں تو کچھ نہیں۔ لاکھوں ایمان کی باتیں ہوں سب عبث، سب بے کار ــــ اور یہی ہمارے عمل کا نقطۂ آغاز ہوگا کہ وہ کیا ہو اور کیسا ہو ــــ؟

قرآنِ کریم کی ضمانت اور اللہ تعالیٰ کی یقین دہانیوں کی نشاندہی میں کرتا ہوں، تصدیق آپ کرتے جائیے کہ آپ سب کے گھروں میں موجود ہے۔ حوالہ ۳۶ ــ ۳۶/۳۵۔ ربّ العزت نے فرمایا کہ

"..... ایسا ہو نہیں سکتا کہ اللہ کے مقرر کردہ قاعدے قانون کے مطابق عمل کیا جائے اور نتیجہ صحیح، ثبت اور قرآفریں برآمد نہ ہو ــــ"

مفہوم القرآن کے صفحہ ۱۰۲۳ پر اس ۳۶/۳۶ کا مفہوم پیش کرتے ہوئے ابتدا ہی ان الفاظ سے کی گئی ہے۔

"اور اس کا یقین رکھو کہ اگر تم نے (اللہ کے) اس قانون کا اتباع کیا تو اس کے یہ نتائج مرتب ہو کر رہیں گے۔ اللہ کے متعلق ایسا وہم و گمان بھی نہ کرو کہ اس نے جو کچھ کہا ہے ویسا نہیں ہوگا ــ تم دیکھتے نہیں کہ اس کے قانون کی رُو سے نباتات میں کس طرح قسم قسم چیزیں پیدا ہوتی ہیں اور کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ اس کے قانون پر عمل کیا جائے اور نتیجہ وہی برآمد نہ ہو۔"

۳۵/۱۰ حوالہ کے مطابق فرمایا:

"لہٰذا جو قوم قوت، غلبہ اور عزت و تکریم کی زندگی چاہتی ہے اُسے سمجھ لینا چاہیئے کہ ایسا اللہ کے قوانین اپنانے اور ان کی پیروی کرنے ہی سے حاصل ہوگا (کسی اور طریقے سے ہرگز ہرگز نہیں)۔"

اللہ تعالیٰ کس کس طرح یقین دلا رہا ہے۔ کیسی کیسی ضمانتیں دے رہا ہے۔ (۵/۷۷) ملاحظہ کیجئے۔

"(اے رسولؐ) انہیں بتا دو کہ اِس طبعی زندگی کے مفاد، خواہ کتنے ہی زیادہ کیوں نہ ہوں، آخرت کی زندگی کے فائدوں کے مقابلہ میں کچھ حقیقت نہیں رکھتے۔ جو لوگ اللہ کے قوانین کی پیروی اور نگہداشت کرتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ مستقبل کے فائدے خیر و برکت والے ہوتے ہیں۔ سو یہی لوگ ہیں جن کی محنت اور کوشش کے معاوضہ میں کمی نہیں کی جاتی۔"

وہ لوگ غور سے سُنیں جو سمجھتے ہیں کہ قرآن کو اپنا کر اس معاشرہ میں کیسے زندہ رہ سکیں گے۔ قرآن کا حوالہ

ہے (۵/۷۸)۔

"باقی رہا یہ خیال کہ اس نبرد آزمائی میں تمہیں موت واقع ہو جائے گی تو موت کو بہرحال آنا ہے۔ اگر تم مضبوط قلعوں کے اندر بھی چھپ جاؤ تو وہ وہاں بھی آکر رہے گی۔ جب یہ اٹل حقیقت ہے تو پھر ذلت کی زندگی پر تم موت کو ترجیح کیوں نہیں دیتے۔ طبعی موت تو ایک بے اختیار عمل ہے اور اللہ کے قانون کی پیروی میں جان دینا ایک با اختیار عمل ہے۔ (یعنی موت تو ہم چاہیں نہ چاہیں آ ہی جائے گی لیکن اللہ کے مشن کی تکمیل کرنے میں جان دے دینا ہمارے اپنے ارادہ اور اختیار میں ہے) اور صحیح زندگی کا راز ایسی موت میں ہی پوشیدہ ہے۔"

اللہ کی طرف سے ایک اطمینان اور یقین دہانی اور حاصل کر لیجئے۔ حوالہ ہے (۵/۷۹)۔

"ہر وہ عمل جو اللہ کے قوانین کے مطابق ہوگا اُس کا نتیجہ ہمیشہ خوشگوار ہوگا اور جو کام تم اپنے ذاتی فیصلوں کے مطابق کرو گے یعنی وہ اللہ کے قوانین کے تابع نہیں ہوں گے تو ان کا نتیجہ خوشگوار نہیں ہوگا۔"

اللہ کی طرف سے اتنی یقین دہانیوں اور اس کائنات میں بکھری ہوئی ان گنت صداقتوں کو دیکھنے کے باوجود اگر اللہ کو تم اعتماد اور بھروسے کے قابل نہیں سمجھتے اور تم اس پر ایمان نہیں لاتے تو (۴۵/۶) کے حوالہ سے اللہ خود تم سے پوچھتا ہے کہ بتاؤ تو سہی پھر آخر وہ کونسی ایسی بات ہے جس پر ایمان لاؤ گے؟

اور آخری بات بھی اللہ ہی کی طرف سے سُن لیجئے۔ حوالہ ہے ۴/۷۸۔

"ان سے کہہ دو کہ اگر تم دھاندلی سے اپنی بات پر ڈٹے اور جمے رہنا چاہتے ہو اور کچھ سننا اور سمجھنا نہیں چاہتے تو اور بات ہے وگرنہ اصل حقیقت کا سمجھ لینا کچھ مشکل نہیں ہے۔"

لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا ۝

PLEASE DO PRESENT TOLU-E-ISLAM TO YOUR FRIENDS AND ASSOCIATES

ملک حنیف وہمدانی

قومی سوچ کا سورج

میں نے کسی اخبار یا رسالے میں "جواہر پارے" پڑھے تھے جن میں ایک یہ بھی تھا۔

"سورج کی آنکھ نے آج تک اندھیرا نہیں دیکھا۔"

یہ جواہر پارہ جس عظیم حقیقت کا مظہر ہے وہ اغیار کی نہیں، اپنے ہی گھر کی ہے۔ اگر ہم اس کو قومی سوچ کے سورج کی طرف لے جائیں، تو سرزمینِ عرب میں ہمیں یہی سورج طلوع دکھائی دیتا ہے۔ قرآنِ کریم میں ارشاد برائے جناب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہے، موجود ہے:

قُلْ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَ فُرَادٰى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا ۝ (۳۴/۴۶)

کہو میں نصیحت کے لئے تم سے ایک ہی بات کہتا ہوں کہ اللہ کے لئے ایک ایک دو دو کھڑے ہو جاؤ اور پھر سوچا کرو۔

ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا

تم سوچا کرو۔ تم سب ایک انداز سے سوچنا شروع کر دو کہ صرف عقل کے بل بوتے پر نوعِ انسانی کے مسائل حل ہو سکتے ہیں یا علمِ وحی کی بھی ضرورت ہے؟ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں۔

عقلِ خود بیں غافل از بہبودِ غیر
سودِ خود بیند نہ بیند سودِ غیر
وحیِ حق بینندۂ سودِ ہمہ
در نگاہش سود و بہبودِ ہمہ

عقلِ انسانی وحی کے پر لگا کر شہبازِ فطرت بن سکتی ہے۔ وہ اپنے آپ کا اور ہر دوسرے فرد کا جائزہ لینے میں بہترین منصف

کا کردار ادا کر سکتی ہے۔ بقول اقبالؒ

شاہدِ اوّل شعورِ خویشتن
خویش را دیدن بنورِ خویشتن
شاہدِ ثانی شعورِ دیگرے
خویش را دیدن بنورِ دیگرے
شاہدِ ثالث شعورِ ذاتِ حق
خویش را دیدن بنورِ ذاتِ حق

اگر ہماری قومی سوچ کا سورج یوں پھر طلوع ہو جائے تو ہمارے بے شمار مسائل سامنے آجائیں۔ کوئی المیہ، ظلم، دکھ، رنج، بیماری، بے کاری، جہالت، گداگری، یتیمی، بے کسی و بے بسی پوشیدہ نہ رہ سکے۔ اور منظرِ عام پر آجانے والے مسائل حل ہو جایا کرتے ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قومی سوچ کے دھارے کو کس طرح منظم وحدت میں لایا جائے تاکہ وہ قومی سوچ کا سورج بن سکے۔ اس بارے میں ہمیں دوسروں کی غلطیوں اور کامیابیوں کا بھی سرسری جائزہ لینا پڑے گا۔

امریکہ نے روس کو توڑنے کے لئے کیا کیا۔ اِس کے لئے پہلے اُس نے "جمہوریت اور آزاد معیشت" کا نعرہ دیا۔ (یہی نعرہ اب نیو ورلڈ آرڈر میں موجود ہے) اور پھر گورباچوف کے روپ میں جمہوریت اور آزاد معیشت کے لئے قانون سازی کی۔ یہی وجہ ہے کہ روس میں مظاہروں، تشدد اور توڑ پھوڑ کے برعکس، زیادہ تر عمل اسمبلی کے ذریعے عمل میں آیا۔ اس نقطۂ نظر سے اسمبلی قومی سوچ کا بہترین انقلابی دھارا بن سکتی ہے۔ بشرطیکہ اس میں وہی لوگ منتخب ہو کر آئیں جو قومی سوچ کے دھارے کو روبہ عمل لانے کا عہد کر کے منتخب ہوئے ہیں، اور اپنے اس انتخابی عہد کا پاس کرنا جانتے ہوں۔ پھر عہد شکنی کی سزا کا بھی انہیں علم ہو۔ جو عوام اور آئینِ فطرت کی طرف سے مل سکتی ہے اور پھر سارے عہد شکن مل کر بھی اس سزا کو ٹال نہیں سکتے۔

اور پھر

لَو سلاطین لَو کلیسا لَو اِلٰہ

کہنے والے جمہوریت اور آزاد معیشت کو اِلّا کا درجہ نہیں دے سکتے۔ کیونکہ "اِلّا اللہ" کی منزل پر جمہوریت ان مستقل اقدار میں ردّ و بدل نہیں کر سکتی، چاہے ۹۹٪ ہاتھ اس کی حمایت کر دیں اور "اِلّا اللہ" میں آزاد معیشت اس حد تک آزاد ہو گی کہ کسبِ حلال سے حاصل ہو۔ حرام کمائی، کالا دھن، سود، بلازوں کی کروڑ ہا کرایہ داری، جاگیرداری کی نصف بٹائی اور

صلاحیتوں کو فروخت کر کے فیس کمانے کا دھندہ سب ممنوع ہوگا۔

اسلام اپنے نام لیواؤں کو " اَشَدُّ حُبًّا لِلّٰہِ " کا ماٹو دیتا ہے تاکہ اپنی عقلی توانائیوں اور صلاحیتوں کو ملت کے لئے وقف کر دینے کی سوچ پیدا ہو۔ صلاحیتوں کو فروخت کر دینے میں جو " لطیف " فرق ہے وہی تجارت اور سود میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ جہاں صلاحیت وقف ہوگی وہاں محنت، سعی، عمل، جرأت، تحقیق، تجربہ، نشوونما اور ارتقا سب کچھ ہوگا۔ اور جہاں صلاحیتوں کی فروخت ہوگی وہاں صرف سرمایہ اکٹھا ہوگا اور بس!

صلاحیتوں کی فروخت میں نقل اور رسم و رواج سے بھی کام چل جاتا ہے جب کہ صلاحیتوں کے وقف کر دینے میں جو مزہ ہے وہ اقبال کے اشعار میں مل سکتا ہے۔

عشق کے ہیں معجزات سلطنت و فقر و دیں
عشق کے ادنیٰ غلام صاحبِ تاج و نگیں

اس تمام بحث کا حاصلِ کلام یہ ہوا کہ

(۱) جمہوریت ہماری منزل نہیں بن سکتی اس میں اصلاحات کرنی ہوں گی

(۲) آزاد معیشت ہماری منزل نہیں بن سکتی۔ کیونکہ حرام کمائی کا انبار ہمارے لئے بے معنی ہے اور جو کی حلال روٹی قابلِ قبول۔

(۳) ہمیں اپنی صلاحیتیں وقف کر دینے کے لئے میدانِ عمل میں آنا پڑے گا۔ اس کے بغیر ریسرچ (تحقیق) تجربات ارتقا و نشوونما کے میدان میں ہم اقوامِ عالم کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔ اسی سے سائنسی اندازِ فکر ہوگا۔ اور توہمات کے خاتمہ سے ہمارے ہاں قومی سوچ کا سورج طلوع ہوگا۔

(۴) ۱۶ سال کی عمر تک تعلیم کا حصہ قرار دیا جائے اور لازمی تعلیم کے تحت اس عمر تک لڑکوں اور لڑکیوں کو تعلیم کا پابند بنا دیا جائے۔ اس سے موجودہ بے شمار برائیوں کا خاتمہ ہوگا اور نئی پود میں علم کا شوق پیدا ہوگا۔ اس کے لئے حسبِ سابق " اقرار " ٹیکس عائد کر دیا جائے۔

(۵) ملک میں سائنسی اور ٹیکنیکل تعلیم کو لازمی قرار دیا جائے۔ اس پر عمل درآمد کے لئے اساتذہ کی ضرورت ہوگی۔ لہٰذا ذہین طلبا کو ہر ہائی سکول سے لے کر ماڈل سائنس کالج قائم کیا جائے جہاں سائنسی اور ٹیکنیکل تعلیم دے کر انہیں بطور اساتذہ تعلیم بھی دی جائے اور پھر تعلیمی اداروں میں بھیجا جائے۔

(۶) ہائی سکولوں سے تمام سائنس پاس طلبا کو فوج کے حوالے کر دیا جائے جو انہیں سپاہیانہ اور ٹیکنیکل تعلیم ایک ساتھ فراہم کرے اور پھر سول کے حوالے کر دے۔ یہ اخراجات الگ حکومت فوج کو مہیا کرے۔

(۷) میٹرک سائنس پاس طلبا کو محکمہ زراعت کے حوالے کر دیا جائے جو انہیں زرعی تعلیم سے آراستہ کرے اور نصف

پاکستان جو بنجر پڑا ہے اس کی آبادکاری کے لئے "سپاہِ زراعت" تیار کرے۔

(۸) سائنسی اور زرعی ایجادات کرنے والوں کی مالی امداد کی جائے اور انہیں صدارتی میڈل دیئے جائیں۔

ان امور کے علاوہ قومی سوچ کا سورج طلوع کرنے کے لئے پریس کا کردار بڑا نمایاں ہوتا ہے۔ صحافت قومی سوچ کے دھارے کو خاصا بڑا دھکا دے سکتی ہے۔ اس کے علاوہ کتب و رسائل کی اشاعت، لائبریریوں کا قیام اس میں ممد و معاون ہو سکتا ہے۔

خدا نے ہمیں زندگی دی، صلاحیتیں دیں اور بے شمار کائناتی وسائل دے کر دعوتِ غور و فکر دی۔ اس کے ساتھ آخری نبی جناب محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلّم کے ذریعہ آخری کتاب قرآنِ مجید عطا فرمائی۔

مسلمان کی زندگی فکرِ انسانی اور علمِ وحی کے استفادہ سے مل کر مکمل ہوتی ہے۔ لہٰذا پورے ملک میں درسِ قرآنِ کریم کے مراکز قائم کئے جائیں۔ نمازِ جمعہ پر جوشیلی فرقہ وارانہ تقاریر کے برعکس درسِ قرآن کی زیادہ ضرورت ہے۔ محکمہ اوقاف کے لئے ضروری ہے کہ وہ نظامِ مساجد قائم کرے اور تمام جامعہ مساجد میں درسِ قرآنِ کریم کا بندوبست کرے تاکہ مسلمان نماز میں پڑھے جانے والے قرآن کو سمجھ بھی سکیں۔

اس طرح فکرِ انسانی اور علمِ وحی کے حسین امتزاج سے جو روشنی پھوٹے گی وہی ہماری قومی سوچ کا سورج ہوگا آیئے اس کام کے لئے اپنی صلاحیتوں کو وقف کر دیں۔

TOLU-E-ISLAM IS NOT JUST A JOURNAL.
IT IS A MOVEMENT FOR SPREADING QURANIC KNOWLEDGE

حافظ محمد یعقوب تاجک

تصورِ توحید

اللہ تعالیٰ قرآنِ حکیم میں فرماتے ہیں۔ لَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَۃٌ۔ تین اقانیم مت کہو۔ خدا کی ذات ایک ہے۔ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ، اللہ ایک ہے اور ایک ہی اللہ ہے جو دنیا کے تمام انسانوں کا خالق ہے، رزق عطا کرتا ہے، موت دیتا ہے۔

تین اقانیم یعنی تین خداؤں کو ملا کر ایک خدا کا تصور اور پھر اس مجموعۂ خدا کا کائنات پر کنٹرول اور پھر اسی خدا کے وجود میں سے انسانوں کا ظہور پذیر ہونا اور انسانوں کے مرجانے کے بعد اسی خدا کے وجود میں انسانی روحوں کا سما جانا، ایک ایسا فلسفۂ حیات ہے جو دنیا کے مختلف مذاہب میں ہی نہیں بلکہ اپنی مخصوص شکل میں مسلمانوں کے اندر بھی کہیں نہ کہیں موجود ہے اور اس کی اس طرح کی موجودگی سے اس تصورِ توحید کی نفی ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے حوالوں سے دنیا کے انسانوں کو بتائی ہے۔

ابنیتِ مسیحؑ اور الوہیتِ مسیحؑ اور اقانیم ثلاثہ کا مذہب رکھنے والے عیسائیت کے پیروکار یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ یسوعؑ خدا کا حلول و تجسیم کا جسمانی مظہر تھا۔ ایک گروہ مسیحؑ کو خدا کا بیٹا مانتا ہے۔ دوسرا گروہ خدا مانتا ہے تیسرا گروہ خدا بھی اور بندہ بھی مانتا ہے۔

خدا اور خدا کا بیٹا اور روح القدس مل کر ایک خدا جہاں بن جاتا ہے، وہاں یہ تینوں الگ الگ خدائی میں برابر کے شریک بھی ہو جاتے ہیں۔ (یعنی تین میں ایک اور ایک میں تین۔ تثلیث فی التوحید اور توحید فی التثلیث) عیسائیت کا مسلّمہ عقیدہ اگرچہ یہی ہے لیکن اس عقیدے کی تشریح میں بعض عیسائی فلاسفہ اختلاف کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ باپ، بیٹا اور کنواری مریم تین اقنوم ہیں اور ان تین کا مجموعہ جو ہے وہ خدا ہے۔

اسی طرح ہندومت میں ایشور یا خدا کا تصور جو ہے وہ بھی تین دیوتاؤں کی تقسیم ثلاثی ہے۔ یعنی برہما (خالق) ہے۔ وشنو (پالنے والا) ہے اور شیو (موت فنا والا) ہے۔ ان دیوتاؤں کی جہاں جداگانہ اور انفرادی

حیثیت ہے وہاں ان تینوں کا منصب مساوی ہے اور ہندو دھرم میں یہی وہ تثلیث ہے جو اِلٰہ کا تصور دیتی ہے اور تثلیث کے حوالے سے برہما دیوتا روح الارواح کے عہدہ پر قائم ہے اور خالقِ کائنات ہونے کی جہت سے اس میں جذب ہو جانا انسانیت کی انتہا ہے۔ وشنو جو خوشحالی کا خدا ہے انسانوں، حیوانوں، پرندوں، پھلوں اور پودوں میں ظہور کرتا ہے۔ شیو تباہی لاتا ہے۔ موت اور عذاب اسی کے منشور سے ہیں۔

اسی طرح ویدوں سے معبود کا تصور جو سامنے آتا ہے اس میں تمام دیوتا ایک دیوتا ہیں، ایک معبود میں تحلیل کر جاتے ہیں۔ اور معبود کی اس جامعیت میں پھر باپ بھی ہے، بھائی بھی ہے، مرد بھی ہے، کنواری بھی ہے، آنکھ بھی ہے اور دانت کی بُو بھی ہے۔

اسی طرح بدھ مت کے بنیادی فلسفہ نروان میں بندے کی روح بھگوان کی روح سے اتصال کر جاتی ہے — (وجودی صوفیاء کا عقیدہ بھی کم و بیش یہی ہے)۔

اور اسی طرح مجوسیت کے مقدّس اور الہامی (پروہتوں کی مدوّن کردہ کتب) تصورِ اِلٰہ میں ثنویت ہے۔ برابر کی قوتیں ہیں جو غاصبانہ طور پر متصادم ہیں۔ زندگی کا موت سے اور خیر کا شر سے مقابلہ ہے اور یہی دو قوتیں رواں دواں ہیں۔

غرضیکہ ان تمام مرکزی عقائد کی جن میں غیر خدا کی پرستش بھی خدا کی پرستش تصور کی جاتی ہے اور جہاں انسانی زندگی کو خدا کی پیدا کردہ مخلوق کا حصہ نہیں بلکہ خود خدا کی ذات کا حصہ مانا جاتا ہے، اللہ ربّ العٰلمین نے سختی سے تردید کی ہے اور انسانوں کو مخاطب کرتے ہوئے صراحت سے بتایا ہے کہ تثلیث کی فرمانروائی اور فطرت کے مظاہر کی پوجا سے نجات کے تصوّرات جو تم نے بنا لئے ہیں وہ میرے دستور سے نہیں ہیں۔ یہ امر واقع ہے کہ میرے ایک ہونے پر بھی تم سجدۂ عبودیت مجھے نہیں کرتے اور وحدانیت کے علاوہ ان مثلثی تصورات کو اپنے دلوں میں جگہ دیتے ہو جو مشرکوں نے میرے ساتھ شریک ٹھہرا دیئے ہیں۔

اللہ کی وحدانیت کو تسلیم نہ کرنے سے جہاں انسانوں کے مختلف طبقات، ذات پات کے امتیازی سلوک، ذہنی غلامی کے رجحانات ابھرتے ہیں وہاں توحید و رسالتؐ، تخلیق کے مقاصد، اقدار کی ترویج، امر و نہی کی پابندی، کردار کی صحیح تشکیل سب دب کے رہ جاتی ہے۔

علمِ دین کے لحاظ سے اللہ احد ہے، خالقِ کل ہے، بالاتر ہے، حاکمیت اُسی کی ہے۔

انسان فطری اعتبار سے اللہ کی ذات کا حصہ نہیں ہے۔ خالق کا وجود مخلوق کے وجود سے الگ ہے۔ اللہ کے اقتدار میں کوئی شریک نہیں۔

مرحوم علی بن عثمان الجلالی (داتا گنج بخشؒ) نے ایک جگہ لکھا تھا

"روح مخلوق ہے، تابع فرمانِ حق ہے۔ اس کے خلاف عقیدہ رکھنے والے صریحاً غلط راستے پر ہیں"۔

"ذاتِ حق ایک ہے۔ اپنی ذات وصفات میں تقسیم سے بالاتر ہے، بے مثال ہے، لاثانی ہے، اپنے افعال میں لاشریک ہے، وہ کسی چیز میں مدغم نہیں کہ اس چیز کا جزو جنس بن جائے۔ کسی چیز کو اس سے رشتہ نہیں کہ اس کا جزو بن جائے۔ اس کی ذات میں تغیر نہیں کہ اس کا وجود متغیر ہو جائے۔ حکم صرف اسی کا رواں ہے"۔

ویبقیٰ وجہ ربّك ذوالجلال والاکرام

مزمل حسین بخاری

شمالی یورپ میں

رمضان شریف اور نمازیں

رمضان شریف کی آمد آمد ہے۔ افطار پارٹی اور تراویح و اعتکاف کے پروگرام مرتب ہو رہے ہیں۔ مجھ جیسے کچھ گنہ گاروں کی نظریں "ستاروں سے بھی آگے" یعنی رمضان شریف کی گہما گہمی سے زیادہ زور عید ملن پارٹیوں پر ہے۔ گنہگار ہی سہی لیکن پھر بھی بحیثیت مسلمان یہ دیکھ کر دکھ ہوتا ہے کہ رمضان شریف کا بابرکت مہینہ اخوت اور اتحاد کی بجائے قوم کو مزید بکھیر کر رکھ دیتا ہے اور عید کا دن بذاتِ خود وعید بن کر رہ جاتا ہے۔ ایک ہی شہر، ایک ہی قصبے بلکہ ایک ہی محلے میں دو دو عیدیں منائی جاتی دیکھی گئی ہیں۔ ہم اپنے ملکوں میں تو شاید اس نفاق کے عادی ہو چکے ہوں لیکن غیر مسلم ممالک، خاص طور پر اسلام دشمنی رکھنے والے ممالک میں جب ہم اس قسم کے طرزِ عمل کا مظاہرہ کرتے ہیں تو اس طرح ہم صرف اپنے آپ اور اپنے ملک کی ہی نہیں بلکہ خود مذہب اسلام کی سُبکی کے بھی اسباب فراہم کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں غیر مسلم یہ بات کہنے میں حق بجانب ہوتے ہیں کہ جو اسلام خود تم لوگوں میں اخوت اور اتحاد پیدا نہیں کر سکا ایسے اسلام سے ہم دُور ہی بھلے۔

آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ عام وجوہات میں سرفہرست ہے جہالت، ضد اور کم علمی۔ بظاہر دیکھنے میں اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ یہ کہتے ہوئے سُنے گئے ہیں کہ "اعتقاد میں اختلاف تو ہوگا ہی کیونکہ بزرگوں کے کہنے کے مطابق بہتر (۷۲) فرقے بنیں گے۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ بہتر (۷۲) فرقوں کی نوید سنانے والے سرِعام قرآن کی تعلیم کی نفی کر رہے ہیں قرآن تو اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے تھامنے کی تعلیم دیتا ہے۔ یعنی اتحاد کی تعلیم۔ اگر یہ محض پیشینگوئی ہے تو اس کا جواب یہی ہے کہ اسلام میں پیشینگوئیوں کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔

اس وقت غیر اسلامی ممالک میں رہنے والے مسلمان، خاص طور پر ناروے اور شمال مغربی یورپی ممالک میں رہائش پذیر مسلمانوں کو ایک بہت بڑے مسئلے کا سامنا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ان ممالک میں نماز اور روزے کے اوقات کیا

ہونے چاہئیں۔

یہ بات شک و شُبہ سے بالاتر ہے کہ اسلام میں ایسی کسی بھی عبادت کا تصور نہیں ہے جو کہ بذاتِ خود کسی مسلمان اس کے اہلِ خانہ یا دیگر احباب کے لئے پریشانی کا باعث بنے۔ یعنی حقوق العباد پر زد پڑنے کا امکان ہو۔ رہبانیت کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

سب سے بڑھ کر یہ کہ عبادت، خاص طور پر نمازوں کی ادائیگی کے اوقات میں ایک تواتر ہے۔ یعنی نمازوں کی ادائیگی کے اوقات اس طرح مرتب کئے گئے ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ انسان کاروبارِ زندگی میں منہمک ہو کر یادِ الٰہی سے غافل ہو جائے، یعنی کاروبارِ زندگی کے آغاز سے قبل نمازِ فجر، عین درمیان میں ظہر کی نماز، کاروبار سمیٹنے سے کچھ دیر قبل عصر اور پھر آخر میں مغرب کی نماز، اس کے بعد جب انسان دن بھر کی مصروفیاتِ زندگی سے فارغ ہو کر تکان دُور کر چکا ہوتا ہے تو پھر عشاء کی طویل نماز۔ اس نماز کی طوالت کا مقصد ہی یہی ہے کہ انسان اپنے آپ کو شب کے اندھیروں کے لہو و لعب سے محفوظ رکھ سکے۔

آخر یہ اوقات کس طرح مرتب ہوئے؟

اسے اتفاق سمجھئے یا قدرت کی کوئی خاص مصلحت کہ دنیا کے نقشے میں اسلامی مملکت کی اکثریت خطِ استوا کے شمال میں خطِ سرطان اور جنوب میں خطِ جدی کے مابین واقع ہے۔ بذاتِ خود دنیائے اسلام کا مرکز یعنی خانہ کعبہ (مکہ معظمہ) بھی اسی خطے میں (۲۱° ۲۷' N) واقع ہے۔ یہ ایک ایسا خطہ ہے جہاں سال بھر دن رات برابر ہوتے ہیں یا پھر ان میں کوئی زیادہ فرق نہیں ہوتا۔ مثلاً خطِ سرطان، خطِ استوا یعنی زمین کے مرکزی خط سے شمال کی جانب ۲۳½° پر واقع ہے اور خطِ جدی، جنوب کی جانب ۲۳½° پر واقع ہے۔ ہر درجے پر ۴ منٹ کے فرق کے حساب سے سال بھر میں طلوعِ آفتاب اور غروبِ آفتاب کا زیادہ سے ایک گھنٹہ چونتیس منٹ کا فرق ہوتا ہے۔ یعنی شمالی خطے میں جہاں پاکستان بھی واقع ہے، موسمِ گرما میں دن زیادہ سے زیادہ تین گھنٹے آٹھ منٹ طویل ہو گا اور موسمِ سرما میں کم سے کم تین گھنٹے آٹھ منٹ مختصر ہو گا۔ یہ بھی صرف چند دنوں کے لئے۔ اس کے بعد خطِ سرطان اور خطِ جدی سے جوں جوں ہم شمال یا جنوب کی جانب سفر کرتے جائیں گے یہ فرق نمایاں تر ہوتا جائے گا۔ اس کی واضح مثال آپ یہاں ناروے اور دیگر شمالی ممالک میں دیکھ سکتے ہیں۔

قرآنِ پاک کا عربی زبان میں نزول محض اس لئے ہوا تھا کہ اس وقت اس خطۂ زمین کی زبان عربی تھی اور مقصد تھا کہ لوگ اسے سمجھ سکیں۔ ظاہر ہے کہ اگر اس وقت اس خطۂ زمین کی زبان فارسی، انگلش، فرنچ یا کوئی اور زبان ہوتی تو قرآن کا نزول بھی یقیناً انہی میں سے کسی زبان میں ہوتا، جیسے اس سے قبل الہامی کتب کا نزول عبرانی اور دیگر زبانوں میں ہوا ہے۔ اگر قرآن میں خدا تعالیٰ نے سرپٹ بھاگتے ہوئے گھوڑوں اور روغنِ زیتون کی قسم کھائی ہے تو محض اس

لئے کہ یہ چیزیں اس وقت عربوں کی ضروریاتِ زندگی کا جزوِ لاینفک تھیں۔

خطۂ عرب کے نخلستانوں اور تپتے ہوئے صحراؤں میں سورج اور چاند کو اس لئے غیر معمولی اہمیت حاصل رہی ہے ہے، (ویسے تو اکثر مذاہب میں سورج اور چاند کی پرستش بھی ہوتی رہی ہے) کہ اگر دن کے وقت سورج نے زندگی کو توانائی بخشی ہے تو رات کے وقت چاند کی روشنی انہیں راحت اور ٹھنڈک پہنچانے کے علاوہ سفر کے لئے سہولت بھی مہیا کرتی رہی ہے۔ دنیا کے اکثر ممالک اور اقوام نے وقت کی پیمائش کے لئے سورج یا چاند کی گردش کو منتخب کیا ہے، لیکن عربوں نے ان دونوں سے ہی استفادہ کیا ہے۔ اگر ہمارا مذہبی سال (ہجری سال) چاند کی پیروی کرتا ہے تو عبادات کے لئے طلوع و غروبِ آفتاب کو ایک پیمائش کے طور پر اہمیت ہے۔ لیکن یہ اہمیت محض علامتی ہے۔ یعنی کاروبارِ زندگی کے آغاز اور اختتام کی علامت۔ جیسا کہ پہلے لکھا گیا ہے، استوائی خطے میں سال بھر میں دن اور رات کے مابین زیادہ فرق نہیں ہوتا۔ اس لئے عام طور پر طلوعِ آفتاب سے لے کر غروبِ آفتاب کے وقت کو کاروبارِ زندگی کے لئے مخصوص کر دیا گیا۔ پہلے زمانے میں گھڑی وغیرہ تو ہوتی نہیں تھی۔ (اگر کچھ محققین نے ریت یا پانی کی مقدار کی مناسبت سے کچھ پیمانے مقرر بھی کئے تھے، تو پھر بھی ان کی موجودگی صرف تجربہ گاہوں تک ہی محدود تھی)۔ صبح کا آغاز عام طور پر مرغ کی اذان سے اور دن کے مختلف حصوں کو سایوں کی کمی بیشی سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اردو لٹریچر میں تو شام یعنی غروبِ آفتاب کے بعد کے وقت کو 'چراغ جلے' کہا جاتا رہا ہے۔ مثلاً چراغ جلے تشریف لے آئیے۔

مضمون کو آگے بڑھانے سے پہلے ہمیں فراخدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ تسلیم کر لینا چاہیئے کہ مذہب اسلام صرف مڈل ایسٹ یا استوائی خطے کے ممالک کے لئے ہی نازل نہیں ہوا بلکہ یہ پوری دنیا کے لئے ہے، دنیا کے کونے کونے کے لئے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آغازِ اسلام سے ہی دنیا بھر کے مختلف ممالک کی طرف تبلیغ کے لئے مبلغین بھیجنے کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا، اس میں ہندو مذہب والی کوئی تنگ نظری نہیں ہے کہ سمندر کے سفر کو بھی ممنوع قرار دے کہ سمندر کے دوسری طرف بلائیں رہتی ہیں۔ (قدیم ہندو مت کا یہی عقیدہ ہے)۔

اگر مذہب اسلام کو دنیا بھر کے انسانوں کے لئے پسند کیا گیا ہے، اور یہ ہے بھی عالمگیر حقیقت، تو ظاہر ہے کہ اس میں کوئی بھی ایسی پابندی شامل نہیں ہو سکتی جو کہ کسی بھی علاقے کے جغرافیائی حالات کے تحت مسلمانوں کے لئے پریشانی کا باعث بنے۔ اگر صوم و صلوٰۃ کے لئے اوقات مقرر کئے گئے تھے اور اس کے لئے سورج اور چاند کی گردش کو پیمائش کے طور پر استعمال کیا گیا تھا تو پھر ذہن میں یہ بات بھی رکھنا چاہیئے کہ دنیا میں ایسے علاقے بھی ہیں جہاں کئی کئی ہفتوں بلکہ مہینوں تک سورج کے طلوع یا غروب ہونے کا کوئی وقت ہی مقرر نہیں، اور یہی حال چاند کا ہے۔ دنیا کے انتہائی جنوبی اور شمالی علاقوں میں کئی کئی دن تک چاند کے طلوع یا غروب ہونے کا کوئی وقت نہیں ہے۔ حوالے کے لئے دیکھئے۔ (ALMANAKK FOR NORGE)

ان حالات میں نماز اور روزے کے اوقات کس طرح مرتب ہونے چاہئیں؟ یہ بات ذہن میں رکھیں کہ نماز اور سحری وافطاری کے لئے طلوعِ آفتاب یا غروبِ آفتاب اور اس کے مابین فرق کو ہم محض بطور علامت استعمال کرتے ہیں۔ اصل مقصد ہے روزمرہ کاروبار کا آغاز اور اختتام۔ اور پھر ان عبادات کو پورے دن کی مصروفیات پر محیط کردیا گیا ہے تاکہ یادِ الٰہی سے غفلت اور عام روزمرہ زندگی میں بہکنے کا امکان ہی نہ رہے۔

کچھ کم فہم لوگ یہ کہتے ہیں کہ سورج چاہے گھنٹے دو گھنٹے کے لئے ہی طلوع کیوں نہ ہوتا ہو، آخر اس کے طلوع اور غروب ہونے کا کوئی وقت تو ہے۔ مسلسل کئی ہفتوں بلکہ مہینوں تک طلوع یا غروبِ آفتاب کو وہ فراموش کردیتے ہیں۔ چلئے فرض کیجئے کہ سورج واقعی دو گھنٹوں کے لئے طلوع ہوا ہے۔ اس کے بعد کیا ہوگا؟ دو گھنٹوں کے اندر اندر آپ نے ظہر اور عصر کی نماز ادا کرنا ہے اور اس کے بعد بائیس گھنٹوں میں مغرب، عشاء اور فجر کی نماز۔ اور پھر موسمِ گرما میں جبکہ سورج صرف دو گھنٹوں کے لئے غروب ہوتا ہے۔ اس صورت میں دو گھنٹوں کے اندر اندر آپ نے مغرب، عشاء اور پھر فجر کی نماز ادا کرنا ہے۔ ان حالات میں روزمرّہ زندگی پر محیط عبادات کا تواتر کہاں گیا؟ اگر رمضان شریف کا مہینہ ہے تو پھر انہی دو گھنٹوں کے اندر آپ نے افطاری، نمازِ مغرب، عشاء، تراویح، سحری اور فجر کی نماز ادا کرنا ہے اور پھر بائیس گھنٹوں کا طویل روزہ۔ اس کے برعکس سردیوں کے موسم میں صرف ڈیڑھ، دو گھنٹے کا روزہ!

کیا ان باتوں کی کوئی تک ہے! فرض کیجئے کہ ان حماقتوں کو بھی درست مان لیا جائے، تو پھر ان علاقوں میں کیا ہوگا جہاں مسلسل کئی کئی ہفتے بلکہ مہینوں تک دن اور رات ہوتے ہیں۔ کیا ان علاقوں کے لئے اسلام کا نزول نہیں ہوا؟ مزید آگے بڑھئے، خلائی جہازوں میں کئی کئی مہینوں تک مسلسل سفر کرنے والے (فرض کیجئے اگر مسلمان ہیں) نماز یا روزے یا محض نماز کے لئے ہی سہی، کون سے طلوع یا غروبِ آفتاب کو صحیح سمجھیں گے کیونکہ سورج تو مسلسل ان کے سامنے ہے۔ یا پھر چاند پر پہنچ کر انسان کونسے چاند کو دیکھ کر اسلامی کیلنڈر کا شمار کرے گا؟

موجودہ دَور میں یہ مسئلہ اجتماعی طور پر اس وقت پیدا ہوا جب کہ پہلی جنگِ عظیم کے دوران افریقہ اور ایشیاء کے فوجی مسلمانوں (برٹش کالونی کی مسلمان فوجیں) کو شمالی یورپ میں آنے کا اتفاق ہوا۔ اس وقت ان فوجیوں کے ذہن میں یہ بات بیٹھی ہوئی تھی کہ فجر کی نماز صبح چار اور پانچ بجے کے درمیان ادا کرنا ہے۔ ظہر کی نماز دوپہر دو بجے، عصر پانچ بجے، مغرب چھ بجے اور عشاء کی نماز رات کو آٹھ نو بجے ادا کرنا ہوگی۔ یہی حال رمضان شریف میں سحری اور افطاری کا تھا، لیکن یہاں حالات ہی مختلف تھے، یعنی رات کے دو بجے ہیں لیکن سورج چمک رہا ہے۔ اس لئے سحری یا فجر کی نماز کا کیا کریں؟ سردیوں کے موسم میں کئی کئی ہفتوں تک سورج صرف ڈیڑھ دو گھنٹوں کے لئے طلوع ہوتا ہے۔ اب کیا کیا جائے؟ ایسی صورتِ حال نے ان مسلمان فوجیوں میں بے اطمینانی پیدا کردی تھی۔ جنگ کا زمانہ تھا اس لئے ایسی بے اطمینانی انگریزوں کے لئے نقصان دہ ثابت ہوسکتی تھی۔ جب عام علماء اس پیچیدگی کا کوئی قابلِ قبول حل تلاش نہ کرسکے تو بالآخر اس وقت

کے مفتیٔ اعظم فلسطین سے رابطہ قائم کیا گیا۔

مفتیٔ اعظم فلسطین نے یہ فتویٰ دیا کہ ایسے جغرافیائی حالات میں بہتر ہے کہ سعودی عرب، خاص طور پر مکہ معظمہ کے اوقات کو اپنایا جائے۔ مکہ معظمہ، جہاں مسلمانوں کا کعبہ ہے، اسلام کا مرکز ہے۔ مثال کے طور پر اگر مکہ معظمہ میں فجر کی نماز صبح پانچ ادا ہوتی ہے، تو یہاں ناروے بلکہ پورے یورپ میں صبح کی نماز پانچ بجے ہی ادا کی جائے۔ اسی طرح ظہر، عصر، مغرب اور عشاء کی نمازیں ادا کی جائیں اور یہ اوقات تقریباً یہی ہوں گے۔ فجر کی نماز صبح پانچ بجے، ظہر کی نماز دوپہر ڈیڑھ دو بجے، عصر تقریباً ساڑھے چار بجے، مغرب شام چھ بجے اور پھر عشاء کی نماز کا وقت مقرر کر لیا جائے جو کہ تقریباً رات کے آٹھ نو بجے ہوگا۔ جب نمازوں کے اوقات کا تعین ہو جائے، تو پھر اسی تناسب سے رمضان شریف میں سحری اور افطاری کے اوقات بھی مرتب ہو سکتے ہیں۔

میں نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح سعودی عرب میں نماز اور سحری و افطاری کا شیڈول مل جائے۔ سعودی عرب کی ایمبیسی کو فون کیا۔ یہاں سے حج کے لئے روانہ ہونے والے افراد سے بھی ایسا شیڈول حاصل کرنے کی درخواست کی لیکن کامیابی نہ ہو سکی۔

کیا ہی بہتر ہو کہ دنیا بھر کے مسلمان اپنے اپنے ممالک میں ان اوقات کو اپنا لیں۔ اس طرح یک جہتی اور اتحاد کا زبردست مظاہرہ ہو سکتا ہے۔ یہاں یورپ کے تقریباً تمام ممالک کے اوقات یکساں ہیں، یعنی (CET) CONTINENTAL EUROPEAN TIME۔ یہی نہیں بلکہ دفاتر، فیکٹریز اور تعلیمی اداروں وغیرہ کے اوقات بھی یکساں ہیں۔ تقریباً صبح سات بجے زندگی کی گہما گہمی شروع ہو جاتی ہے اور شام چار پانچ بجے تک لوگوں کی اکثریت اپنے گھروں میں پہنچ جاتی ہے۔ یہی حال پاکستان، سعودی عرب اور دنیا کے دیگر ممالک کا ہے۔ آپ دنیا کے کسی بھی ملک میں چلے جائیں آپ کو تقریباً ہر جگہ یہی اوقاتِ کار ملیں گے، سوائے چند ایک ایسی جگہوں کے جہاں گرمیوں میں دوپہر کے وقت انتہائی شدید گرمی کی وجہ سے چند گھنٹوں کے لئے کاروبار بند کرنا پڑتا ہے اور اس کے بدلے شام کے بعد وقفے کی اس کمی کو پورا کیا جاتا ہے۔

یہ قدرت کی طرف سے ایک خاص انعام ہے کہ جوں جوں اسلام پھیلتا گیا اسی رفتار سے ذرائع مواصلات اور ٹیکنالوجی میں بھی ترقی ہوتی گئی۔ یہ کمپیوٹر کا زمانہ ہے، انسان چاند سے بھی آگے جانے کے لئے کوشاں ہے اور ہم ہیں کہ محض اس بات پر لڑنے جھگڑنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں کہ ــــ چاند نظر آیا ہے یا نہیں۔ اتنی کسی کو توفیق نہیں ہوتی کہ محکمہ موسمیات، فلکیات یا فلاں تحقیقی ادارے کو ٹیلی فون کر کے تصدیق کر لے۔ بلکہ اس کی بھی ضرورت نہیں، اعداد و شمار (CALCULATIONS) اس قدر مکمل ہیں کہ آج سے پانچ سو سال کے بعد کے متعلق بھی یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ دنیا کے کس حصے میں کتنے بجے چاند طلوع یا غروب ہوگا، اور اگر طلوع ہوگا تو کتنے عرصے تک نظر آئے گا۔ لیکن ہم

جہالت کے مارے ہوؤں کا ذہن ابھی تک وہیں اٹکا ہوا ہے کہ کسی عمارت یا ٹیلے کی بلندی سے چاند نظر آئے۔ اطلاع دینے کے لئے اونٹ بھاگیں اور اس کے بعد مسجد کے نقارے پر چوٹ پڑے تو پھر چاند نظر آنے کی تصدیق ہوگی۔

ہم جدید ٹیکنالوجی سے یہ فائدہ اٹھانے کے لئے تیار ہیں کہ کسی دوسرے شہر میں موجود مولوی صاحبان کو فون کر کے یہ کریں کہ چاند نظر آیا ہے یا نہیں لیکن اپنے ہی شہر کے محکمۂ موسمیات، فلکیات یا خلائی تحقیقی ادارے کو فون کرنا گناہ سمجھتے ہیں۔ یہ ہے جہالت اور کم علمی اور یہ ہے ان مولوی صاحبان کی ضد جن کا مبلغ علم صرف پکی روٹی تک محدود ہے ۔ ان لوگوں نے اسلام کو صرف مسجد کے حجروں تک محدود کر رکھا ہے۔ توسیع فکر کا ان کے ہاں کوئی تصور نہیں ـــ علم حاصل کرو، چاہے تمہیں چین تک ہی کیوں نہ جانا پڑے، کی تشریح بھی ان لوگوں کی نظر میں صرف دینِ ملّا تک ہے وہی دین جس کے متعلق حکیم الامت علامہ اقبالؒ کا کہنا ہے کہ

دینِ ملّا فی سبیل اللہ فساد

ملتِ اسلامیہ کو اسلامی معاشرے میں رہتے ہوئے، بدلتے ہوئے حالات کے تقاضوں کے مطابق ہم آہنگ کرنا ان لوگوں کے بس کا روگ نہیں ہے۔

رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا (۲۰/۱۱۴)

کی تفسیر سیف الملوک یا اس قسم کی دیگر کتب پر عبور حاصل کرنا ہی ہے۔ یہ ہے دین کے ان ٹھیکیداروں کی فہم و فراست کا معیار۔ لیکن اب اس جہالت کو ختم ہونا چاہیئے۔

بائیس گھنٹے یا محض دو گھنٹے کا روزہ ۔ بائیس گھنٹوں میں صرف دو نمازیں اور بقیہ ڈیڑھ دو گھنٹوں میں تین تین نمازیں اور تراویح اس کے علاوہ ۔ یہ دین کے ساتھ مذاق نہیں تو اور کیا ہے ؟ ہونا وہی چاہیئے جو کہ عبادت کا صحیح مقصد ہے، یعنی ـــــــ روزمرہ زندگی پر عبادات کو محیط کر دیا گیا ہے تاکہ انسان کے لئے بھٹکنے کا کم سے کم امکان بھی ختم ہو جائے۔

اب یورپ میں، خاص طور پر شمالی یورپی ممالک میں رہنے والے مسلمانوں کے لئے یہاں کے شب و روز کے بے ڈھنگے فرق سے پیدا ہونے والی پریشانی سے محفوظ رہنے کے لئے ایک ہی حل ہے اور وہ ہے ـــ نماز اور روزے کے اوقات کو سعودی عرب کے اوقات کے مطابق مرتب کریں۔ یہ اوقات تقریباً وہی ہوں گے جن کا پہلے ذکر آ چکا ہے۔ مزید تفصیل کے لئے کوئی بھی صاحب سعودی عرب میں مقیم اپنے کسی عزیز یا دوست کی وساطت سے وہاں سے یہ شیڈول منگوا سکتے ہیں۔ بہتر ہوگا کہ اس کی فوٹو سٹیٹ کاپی پریس کے ذریعے ہر خاص و عام تک پہنچا دی جائے۔ اس طرح پورے یورپ میں ایک ہی وقت میں نمازیں ادا ہوں گی، سحری و افطاری ہوگی اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ ـــ جمعۃ المبارک اور عیدین کی نمازوں میں زبردست اخوت اور اتحاد کا مظاہرہ ہو سکے گا۔ یہی اسلام کی تعلیم اور پیغام ہے۔

بچوں کا صفحہ

اسلامی معاشرت
علامہ غلام احمد پرویزؒ

شراب اور جوا

(۷)

قرآنِ شریف کی پانچویں سورت (المائدہ) میں ہے:

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝ (۵/۹۰)

"اے ایمان والو! یقین جانو کہ خمر اور میسر اور انصاف اور ازلام سب ناپاک فعل اور شیطانی کام ہیں۔ لہٰذا تم ان سے بچو تاکہ تمہاری کوششیں کامیاب ہو جائیں۔"

خمر کے لفظی معنی ہیں ڈھانپ دینا، پردہ ڈال دینا۔ چونکہ

نشہ آور چیزیں

شراب انسان کی عقل پر پردہ ڈال دیتی ہے اس لئے شراب کو خمر کہتے ہیں۔ لیکن خمر کے تحت ہر وہ چیز آ جائے گی جو نشہ آور ہو اور جس سے انسان کی عقل و ہوش پر پردہ پڑ جائے۔ لہٰذا تمام ایسی چیزوں سے پرہیز کرنا ضروری ہے۔

میسرہ

میسرہ کے عام معنی جوا ہیں۔ لیکن اس لفظ کا مادہ یُسر ہے جس کا مطلب ہے وہ دولت جو آسانی سے ہاتھ آ جائے (یسار بائیں ہاتھ کو کہتے ہیں۔ جو کام بالکل آسان ہو اس کے لئے اُردو میں

بھی کہتے ہیں کہ یہ تو میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے)۔ لہٰذا ہر وہ کھیل جس میں داؤ لگایا جائے (جوا، برج، ریس وغیرہ) یا ہر وہ طریقہ جس سے بغیر محنت کئے پیسہ حاصل ہو جائے، ناجائز ہے۔ انسان کو اپنی محنت سے کمائی کرنی چاہیئے۔

انصاب اسلام سے پہلے کعبہ کے گرد چند پتھر گڑے ہوئے تھے، جن پر بتوں کے نام کی قربانی کی جاتی تھی۔ قرآنِ کریم نے اسے ناجائز قرار دے کر مسلمانوں سے کہہ دیا کہ کسی استھان پر یا قبروں پر چڑھاوے چڑھانا منع ہے (جیسا کہ اس باب کے سبق نمبر ۴ (عنوان "کھانا پینا") میں لکھا جا چکا ہے، ہر وہ شے جسے اللہ کے علاوہ کسی اور کے نام کے ساتھ منسوب کیا جائے حرام ہو جاتی ہے]۔

ازلام اس کے لفظی معنی ہیں ایسے تیر جن کی اَنی نہ ہو۔ اسلام سے پہلے عرب اس قسم کے تیروں سے فال لیا کرتے تھے اور قُرعے ڈالا کرتے تھے۔

فال نکالنا قرآنِ کریم نے اسے ناجائز قرار دے دیا، اس لئے کہ وہ چاہتا یہ ہے کہ انسان تمام معاملات کے فیصلے سمجھ سوچ کر، اپنی عقل اور باہمی مشورے سے کیا کرے۔ فالیں نکال کر یا قرعے ڈال کر فیصلے نہ کیا کرے۔

لاٹری ڈالنا یہ انسان کی عقل کی توہین ہے۔ آجکل جس طرح لاٹری ڈالی جاتی ہے، اس کا شمار بھی قرعہ اندازی میں ہی ہے اور اس لئے یہ بھی جائز نہیں۔

یاد رکھو! قرآنِ کریم کی تعلیم یہ ہے کہ انسان اپنی عقل سے کام لے اور محنت سے کمائی کرے۔ اس لئے ہر وہ کام جو اس کی عقل پر پردہ ڈالے اور اسے محنت کا عادی نہ رہنے دے، ناجائز ہے۔

نقد و نظر

کتاب کا نام : عورت کی حکمرانی اور حضرت ابوبکرہؓ کی روایت۔
مصنف : پروفیسر خورشید عالم
ناشر : مکتبہ دانشوراں، چوک اُردو بازار، لاہور۔ قیمت : چوبیس روپے

دنیائے اسلام خاص طور پر پاکستان میں اس بات کا بے حد چرچا ہے کہ ازروئے اسلام عورت کی حکمرانی جائز ہے یا نہیں یا عورت ــــ لیڈر یا حاکم ہو سکتی ہے یا نہیں۔ اس باب میں، قرآن کے فرمان اور حدیث کے بیان میں تضاد پایا جاتا ہے۔ قرآنِ کریم کا فیصلہ ہے کہ اللہ، ربّ الناس ہے، ملک الناس ہے، الٰہ الناس ہے (۱۱۴/۱-۶) اور اس الناس میں مرد اور عورت دونوں شامل ہیں۔ ربّ نے انسان کی تخلیق کی اور انسان کو مکمل اور بہترین شکل میں پیدا کیا (۲۳/۱۱۵ ؛ ۴۰ــ ۷۵/۳۶)۔ پھر ان کے جوڑے بنائے اور انسان کو مختلف فرائض سونپ کر عورت اور مرد میں تقسیم کر دیا (۸/۸ ۷) اور کہیں یہ نہیں کہا کہ اس جوڑے کا ایک حصّہ دوسرے حصّے سے کم تر ہے، آدھا ہے یا نامکمل ہے یا اس جوڑے کا ایک حصّہ ہی حاکم ہو سکتا ہے دوسرا کسی قسم کی قیادت کا اہل نہیں ہے۔ حتّٰی کہ کائنات کی تسخیر کے لئے بھی صرف مردوں کی ہی شرط نہیں لگاتا۔ عورت بھی اسے تسخیر کر سکتی ہے، پھر گناہ ثواب، جرم و سزا، عبادات، اتباعِ قرآن، نظامِ الٰہی کی اطاعت اور جس قدر بھی احکام ہیں، عورت اور مرد دونوں کے لئے ہیں ــــ دونوں برابر ہیں، مساوی ہیں لیکن حدیث قرآن کے اس دوٹوک، واضح اور غیر مبہم فیصلہ کو رد کرتی ہے۔ اس ضمن میں جس حدیث کو بنیاد بنایا جاتا ہے اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی طرف منسوب کیا جاتا ہے وہ حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہٗ سے مروی ہے اور نصِ قطعی کا درجہ رکھتی ہے جس کے مطابق رسولؐ اللہ نے فرمایا۔

"وہ قوم کبھی فلاح نہیں پائے گی جو اپنا والی کسی عورت کو بنالے"

زیرِ تبصرہ کتاب میں اس حدیث کی حیثیت، اس کے راوی حضرات کی حقیقت اور اس کی روایت سے بحث کی گئی ہے اور پروفیسر خورشید عالم صاحب نے نہایت تحقیق اور مطالعہ سے کام لے کر بڑی شرح وبسط کے ساتھ ثابت کیا ہے کہ رسول اکرمؐ سے منسوب یہ حدیث نہ صرف غلط اور بے بنیاد ہے بلکہ رسولِ اکرمؐ کی ذات پر بہتان کا درجہ رکھتی ہے ــــ پروفیسر موصوف کے والد نہ صرف خود محدّث تھے بلکہ خورشید عالم خود بھی علمِ حدیث میں منفرد مقام رکھتے ہیں اور علمی و مذہبی حلقوں میں خاص شہرت کے حامل ہیں۔ "عورت کی حکمرانی اور حضرت ابوبکرہؓ کی

روایت" اس اعتبار سے بھی اہم کتاب ہے کہ اس کے مطالعہ سے عام قاری کے علاوہ علم الحدیث کے طلباء اور اس سے دلچسپی رکھنے والوں کو بھی بیحد اہم مواد مل جاتا ہے۔ حدیث، اُس کے مصادر، اُس کی قسمیں، اُس کی روائتیں، نقدِ حدیث کے معیار، احادیث کا ہدف اور حدیث کا تاریخی جائزہ کے ساتھ ساتھ رجالِ سند، تدلیس التسویہ، تدلیس الاسقاط اور سلسلۂ سند کا جائزہ ایسے مضامین معلومات کا بیش بہا خزانہ ہیں ــــ

تبصرہ کا حق ادا نہ ہوگا اگر قارئین کے لئے حدیثِ زیرِ بحث کا مکمل متن سامنے نہ لایا جائے۔ "..... حضرت ابوبکرہؓ نے نبیٔ کریمؐ کو اس حالت میں دیکھا کہ آپؐ کا سر حضرت عائشہؓ کی گود میں تھا کہ ایک خوش خبری دینے والا آیا اُس نے آپؐ کو آپؐ کے کسی لشکر کی، دشمن پر کامیابی کا مژدہ سنایا۔ پس آپؐ اُٹھے اور سجدہ ریز ہو گئے..... اُس نے آپؐ کو بتایا کہ اُن کی حاکم (اب) ایک عورت ہے جس پر نبیٔ کریمؐ **تین مرتبہ** فرمایا' اب جب کہ مرد عورتوں کی اطاعت کرنے لگے سمجھو کہ وہ ہلاک ہو گئے۔" (صفحہ ۱۴)

پروفیسر خورشید عالم صاحب صفحہ نمبر ۵۸ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"حدیث کے الفاظ سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ کسی قوم کی کوئی عورت بھی کامیاب حکمران نہیں ہو سکتی۔ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ اللہ کے رسولؐ کے مُنہ سے ایسے الفاظ نکلیں جو قرآن اور تاریخی حقائق سے ٹکراتے ہوں وہ تو اپنی خواہش سے گفتگو بھی نہ کرتے تھے اور ان کی باتوں کو وحی کا درجہ حاصل ہے۔ یہ تو ممکن (ہی) نہیں کہ انہوں نے غلط بات کی ہو' ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ غلط بات اُن کی طرف منسوب کر دی گئی ہو۔ یہ ایک بہت بڑا گناہ ہے جس کی سزا جہنم ہے۔"

یہی بات تو زندگی بھر غلام احمد پرویز علیہ رحمۃ کہتے رہے اور صرف اسی ایک بات پر وہ منکرِ حدیث اور منکرِ رسالتؐ ٹھہرائے گئے اور ایک ہزار علماء نے متفقہ طور پر انہیں کافر قرار دے دیا ــ حالانکہ پرویزؒ صاحب منکرِ حدیث قطعی نہ تھے کہتے وہ یہ تھے کہ ہو نہیں سکتا کہ رسولؐ، قرآن اور وحی کے منافی کوئی بات اپنی جانب سے کہے ــ مرحوم ہر اُس حدیث کو دل و جان سے تسلیم کرتے تھے جو قرآنی اصولوں کے عین مطابق ہو اور ہر اس حدیث کو رد کر دیتے تھے جس سے سیرتِ رسالت مآبؐ پر حرف آتا ہو یا جو قرآنی تعلیمات کے منافی ہوں۔

"حدیث کا ہدف" کے عنوان کے تحت جناب خورشید عالم کہتے ہیں کہ حدیث زیرِ بحث کا ہدف اوّل و آخر حضرت عائشہؓ کی ذات ہے۔ حدیث نمبر ۱۰ اور ۱۳ کے الفاظ بول بول کر کہہ رہے ہیں کہ حدیث موضوع ہے اور اس کا نشانہ حضرت عائشہؓ کی ذات ہے۔ کس طرح حضرت عائشہؓ کو بھی ان الفاظ کے صدور کے وقت ظاہر کیا گیا ہے ــــ حدیثِ زیرِ نظر ضعیف ہے..... یہ قطعی طور پر حجت نہیں ہو سکتی۔ (۲) اس حدیث کے پہلے راوی حضرت ابوبکرہؓ کو قرآنی ہدایات کے عین مطابق حضرت عمر فاروقؓ نے "مردود الشہادت" قرار دیا۔ یعنی ان کی گواہی کو ہمیشہ کے لئے

رد کر دیا ــــ حدیث کے سب راوی بصرہ کے رہنے والے ہیں، مکّہ اور مدینے کے رہنے والے کسی صحابی نے اسے روایت نہیں کیا۔ یہاں تک کہ حضرت عائشہؓ کے مخالف صحابہ نے بھی اس حدیث سے دلیل نہیں پکڑی۔ (یہ بھی متنازعہ بات ہے۔ صحابہ کرام ایک دوسرے کے مخالف ہو ہی نہیں سکتے تھے ــــ ادارہ)۔

کتاب حقیقتاً ایک تحقیقی مطالعہ کی حیثیت رکھتی ہے اور پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ سفید عمدہ کاغذ پر کمپیوٹر سے کمپوز کی گئی ہے، صفحات چونسٹھ ہیں اور قیمت چوبیس روپلے ہے جو ہمارے خیال میں زیادہ ہے۔

(ق۔ ن)

درسِ قرآن

طریقۂ کار

(۱) جس جگہ درس ہو رہا ہو وہ سادگی اور صفائی کا بہترین نمونہ ہو۔ (۲) زیادہ سے زیادہ لوگوں کی شرکت کو یقینی بنانے کے لئے درس کی جگہ کشادہ ہو اور دن کا انتخاب بھی مناسب ہو۔ (۳) وہاں تک پہنچنے کے لئے ذرائع آمد و رفت بآسانی میسر آسکتے ہوں۔ (۴) کوشش کی جائے کہ درس وی سی آر پر ہو تاکہ حاضرین بھرپور توجہ اور دلچسپی سے سُن سکیں۔ (۵) اس بات کا خیال رکھا جائے کہ تمام حاضرین یکساں طریقے سے آواز سُن اور تصویر دیکھ سکیں۔ (۶) قرآن کریم مکمل بغیر ترجمہ کے مناسب تعداد میں موجود ہوں تاکہ دوران درس ہر فرد قرآن سامنے رکھے۔ (۷) جیسے ہی درس میں کسی آیت کا حوالہ دیا جائے، درس روک کر اس آیت کو سامنے لایا جائے تاکہ قرآن کو قرآن کے ذریعے سمجھنے کا عمل بہتر طریقے پر سرانجام پاسکے۔ (۸) دوران درس حاضرین کرام مختصراً درس کے نوٹس تیار کریں۔ اس طرح ایک کمرۂ جماعت کا ماحول پیدا ہوگا جہاں سبھی طالب علم اپنی دماغی صلاحیتوں کا بہترین استعمال کرتے ہیں۔ (۹) اگر ممکن ہو تو بعد از درس متعلقہ موضوع پر تبادلۂ خیال کیا جائے اس سے افہام و تفہیم کی راہیں کھلتی ہیں۔ (۱۰) نمائندۂ بزم نئے آنے والے کو خصوصی طور پر خوش آمدید کہیں (۱۱) نئے آنے والوں کو نمائندہ بزم مختصراً درس کے مقاصد اور صاحبِ درس محترم پرویز صاحب کی فکر سے آگاہ کرے۔

درس کے مقاصد

(۱) قرآن کریم کو سمجھا جائے۔ (۲) زندگی کو قرآنی اصولوں کے مطابق ڈھالنے کی حتی الامکان کوشش۔ (۳) اپنے وسائل اور صلاحیتوں کے مطابق قرآنی معاشرے کے قیام کی جدوجہد۔

(۱۲) نمائندہ بزم دورانِ درس موجود رہیں۔ (۱۳) بعد از درس میزبان احسن طریقے سے حاضرین کو خدا حافظ کہیں۔ (۱۴) درس کے دوران بحث و مباحثے اور سگریٹ نوشی کی قطعاً اجازت نہیں ہے۔

تجویز کنندہ:۔ محمد اکبر سعید

قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی

قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی نے 1990ء میں اپنی تشکیل نو کے بعد قرآنک ریسرچ سنٹر کے اپنے منصوبہ کی طرف بھرپور توجہ دی۔ اس ریسرچ سنٹر کی تعمیر کے سلسلہ میں' جس میں سکول' کالج' آڈیٹوریم۔ ریسرچ لائبریری اور ایڈمنسٹریشن بلاک کے علاوہ طلباء اور طالبات کے لئے ہوسٹل اور ریسرچ سکالرز کے لئے رہائشی بلاک بھی شامل ہوں گے' ابتدائی پلاننگ مکمل ہوچکی ہے اور اب تفصیلی پلاننگ DETAILED PLANNING اور ٹائم ٹیبل تیار ہو رہے ہیں۔

اس اہم کام کو ایک نہایت ہی قابل اعتماد اور تجربہ کار ادارہ' وسیم' رضوان اور عامر' لاہور انجام دے رہے ہیں۔

احباب کی طرف سے اب تک موصول ہونے والے عطیات کی فہرست بغرض اشاعت عام شائع کی جا رہی ہے۔

اکاؤنٹ نمبر قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی :-

i) حبیب بنک لیمٹڈ مین مارکیٹ برانچ گلبرگ لاہور 32-5118

ii) حبیب بنک لیمٹڈ ٹولنٹن مارکیٹ برانچ لاہور 01-2013

محمد محسن

فنانس سیکرٹری قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی

فہرست معطیان

		رسید نمبر	مبلغ رقم
1-	عطاء الرحمان ارائیں صاحب	16	= 1,000
2-	میجر محمد یوسف ڈار صاحب	17	= 1,000
3-	محمد عمر دراز صاحب	20	= 1,000
4-	میجر محمد یوسف ڈار صاحب	26	= 1,000
5-	محمد عمر دراز صاحب	27	= 2,000
6-	عطاء الرحمان ارائیں صاحب	28	= 2,000
7-	ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب	29	= 2,000
8-	احباب کوآپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی	30	= 10,000
9-	ڈاکٹر زاہدہ درانی صاحبہ	31	= 2,000
10-	عبیدالرحمان ارائیں صاحب	32	= 2,000
11-	ڈاکٹر کرنل عبدالقدیر خاں صاحب	33	= 1,000
12-	جناب محمود اے ہارون صاحب	34	= 2,000
13-	ڈاکٹر محمد اکرم مرزا صاحب	35	= 5,000
14-	میاں ظفر احسن محمود صاحب	36	= 2,000
15-	جسٹس (ریٹائرڈ) محمد گل قاضی صاحب	38	= 500
16-	یوسف علی ضیاء صاحب	44	= 2,000
17-	ڈاکٹر محمد حیات ملک صاحب	45	= 1,000
18-	بیگم منیر احمد چوہدری صاحبہ	47	= 10,000

19-	یوسف علی ضیاء صاحب	48	1,000
20-	بیگم یوسف علی ضیاء صاحبہ	49	1,000
21-	صلاح الدین ضیاء صاحب	50	3,000
22-	میجر محمد یوسف ڈار صاحب	51	5,000
23-	محمد عمر دراز صاحب	52	5,000
24-	جاوید محسن صاحب	53	1,000
25-	پان افریکن بنک کراچی	54	5,000
26-	کلیوڈن انٹرپرائز کراچی	55	5,000
27-	قاضی فرحت علی صاحب	56	4,000
28-	ایم اے جنجاؤ صاحب	57	1,000
29-	قاضی ایم اے خالد صاحب	58	1,000
30-	محمد ارشد صاحب	59	1,000
31-	عثمان صاحب	60	5,000
32-	فاروق صاحب	61	5,000
33-	اے مجید صاحب	62	5,000
34-	ہمایوں ضیاء صاحب	63	2,000
35-	حاجی اے ستار صاحب	64	1,000
36-	محمود اے ہارون صاحب	65	5,000
37-	ڈاکٹر زاہدہ درانی صاحبہ	71	5,000
38-	عبید الرحمان آرائیں صاحب	72	5,000
39-	جسٹس (ریٹائرڈ) محمد گل قاضی صاحب	73	3,000
40-	بریگیڈیر (ریٹائرڈ) اعزاز الدین احمد صاحب	84	5,000
41-	نصیر احمد شیخ صاحب	85	5,020
42-	عبدالرحمان سبحانی صاحب	86	500
43-	عبدالرحمان سبحانی صاحب	87	600
44-	ملک اللہ یار خان	88	5,000
45-	رشید احمد بٹ صاحب	90	5,000
46-	محمود حسین صاحب	91	500
47-	ایاز حسین انصاری	92	5,020
48-	حکیم محمد افضل صاحب	93	500
49-	محترمہ فاطمہ میمن صاحبہ	94	2,500
50-	ایم اے رحیم صاحب	95	500
51-	محترمہ زینب فیض صاحبہ	97	10,000
52-	حکیم رحمت علی صاحب	98	100
53-	عبدالرحمان سبحانی صاحب	99	1,000
54-	میجر محمد یوسف ڈار صاحب	100	1,000
55-	بیگم بلند اختر صاحبہ	201	10,000
56-	ڈاکٹر محمد اکرم مرزا	204	5,000
57-	محمد طارق صاحب	208	100
58-	میاں خالد محمود صاحب	209	50
59-	محمد محسن صاحب	212	3,000
60-	ڈاکٹر عصمت ضیا دوست صاحبہ	213	50,000
61-	نصیر احمد شیخ صاحب	214	100
62-	غلام احمد صاحب	215	50,000
63-	غلام احمد صاحب	216	1,00,000
64-	ڈاکٹر زاہدہ درانی صاحبہ	301	2,000
65-	ڈاکٹر زاہدہ درانی صاحبہ	302	2,000
66-	محمد عمر دراز	303	1,000
67-	محمد عمر دراز	304	1,000
68-	بیگم خالد ملک صاحبہ	305	5,000
69-	محمد انعام الحق صاحب	306	2,000
70-	میجر محمد یوسف ڈار	307	1,000
71-	غلام احمد صاحب	308	50,000
72-	ڈاکٹر عصمت ضیاء دوست صاحبہ	218	52,500

کرنے کا کام

اگر کسی کے دل میں فی الواقعہ **پاکستان** کا درد ہے اور اس قوم کو تباہی سے بچانے کی تمنا اس کے سینے میں موجزن ہے تو اس کیلئے کرنے کا کام یہ ہے کہ یہاں کے نظامِ مملکت کو **قرآنی اقدار** کے تابع لے آئے۔ اس سے نہ صرف یہ کہ یہ مملکت ہر قسم کے خطرے سے محفوظ ہو جائے گی بلکہ عزّت و ثروت کے اس مقامِ بلند پر پہنچ جائے گی، جہاں سے انسان اپنے مقدّر کے ستارے جھک کر دیکھا کرتا ہے۔

یاد رکھئے!

اس قوم کو نہ سیاسی مہرہ بازیاں بچا سکتی ہیں نہ آئینی فسوں سازیاں، نہ معاشی شعبدہ کاریاں اسے سنبھالا دے سکتی ہیں نہ انتخابی ابلہ فریبیاں اسے بچا سکتی ہیں، اسے بچا سکتی ہیں صرف **مستقل اقدارِ خداوندی** کی جنّت سامانیاں۔ اگر ان سے اعراض برتا گیا تو اس کی تباہی یقینی ہے۔ یہی خدا کی سنّتِ مستمرہ ہے

وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰہِ تَبْدِیلاً۔

اور سُنّت اللہ کبھی بدلا نہیں کرتی۔

یاد رکھیئے!

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملّت کے گناہوں کو معاف

themselves and it is a fire which is without smoke. Moreover if سمّ means poison, even then nothing can be more poisonous than the radiation waves unless they are tamed. With the exception of reflected light rays all other radiation waves. e.g. Cosmic Rays, Gamma Rays, X Rays, Ultra Violet Rays and Heat Rays are hidden. They can be felt but they cannot be seen. We can receive the radio waves on the radio set but these also are invisible. Consequently the hidden creation mentioned in the verse 15:27 which was revealed earlier then the material creation can be nothing else than the radiation waves.

A MISUNDERSTANDING: The non-scientists exegetists while explaining the verse 15:27 have said "Before the creation of man the globe of the earth was extremely hot. Originally there came into existence a creation which could stand extremes of temperature. The creation has now become extinct." This is a baseless supposition. The creation which the Quran points out in the verse is the one which came into existence before the appearance of earth and not on the earth itself, and that was nothing but the radiation waves. In fact energy and matter are one and the same things. Energy can be converted into matter and the matter can be converted into energy; as we find in the case of Atomic Bomb explosion. The purport of the verses 15:27-28 is that the invisible energy (جنّ) was created first and the visible material objects were created from it later, through a long evolutionary process, in which the creation of stars from PROSTARS took place first. The sun is also a star and after the earth separated from the sun, life came into existence in the matter and the earth and the living objects gradually evolved into man

The words فَالْمُقَسِّمٰتِ in the verse 51:4 means the distribution of tasks in the entire universe; this distribution takes place by means of the radiation waves which are hidden. These move with a tremendous speed and penetrate matter in every nook and corner of the universe and make possible the successive emergence of newly created matter in its changing and novel forms. Thus the past, present and future evolution of the material world depends on " Malaika" or the forces of nature. All objects from microscopic and sub-microscopic level, to the level of huge big heavenly bodies are constantly in a condition of flux and change. The energy flux constantly keeps distributed the material world which is never in a state of equilibrium.

As already mentioned the status as affixed by the holy Quran for "Malaika" is that they are sub-subservient to man; and the more man explores nature the more they become subservient.

TOLU-E-ISLAM CONVENTION IS BEING HELD AT
25B, GULBERG II, LAHORE
ON
APRIL 8 & 9, 1993
INTIMATE ETA ON PHONE 876219

قُلْ أُوحِيَ إِلَيَّ أَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوا إِنَّا سَمِعْنَا قُرْآنًا عَجَبًا ۝

"Say: it has been revealed to me that a company of Jinns listened (to the Quran). They said, we have really heard a wonderful recital".

Again it is said in the verse 46:29:-

وَإِذْ صَرَفْنَا إِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُونَ الْقُرْآنَ فَلَمَّا حَضَرُوهُ قَالُوا أَنصِتُوا فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا إِلَىٰ قَوْمِهِم مُّنذِرِينَ ۝

"Behold, We turned towards thee a company of Jinns (quietly) listening to the Quran: when they stood in the presence thereof, they said, 'listen in silence'. When the reading was finished, they returned to their people, to warn (them of their sins)".

The concept of Jinns as a race is not found in the holy Quran. The primitive man called all those objects, the nature of which they could not realize by means of their intellect, as diety and Arabs called them Jinns, because of their invisibility.

I have explained above the word 'Jinn'. Thus the word ..جآن as it occurs in the verse 15:27 means Radiation waves. Here it is said that 'Jann' were created from نارالسموم some commentators have interpretted this word as 'fire without smoke', also 'Fierce blast of fire'. In Arabic dictonaries the word .سموم (root) .....س-م-م means anythings that is light and moves very fast. Ibn-e-Faras says that the basic meanings of this word is the place of entry of one thing into another; accordingly a poison is called ....سمّ.....becuase it panetrates into the body: and hot fast moving wind is called ...سموم.....becuase it is rapidly penetrating. Now let us see what is there in nature which possesses the above said qualities such as being light, fast moving, easily penetrating and extremely hot. It is apparent that nothing can compete the radiation waves in this respect. These are extremely light, tremendously fast moving. Air is also light and fast moving but it has no comparison with radiation waves which move millions of miles in one second. Any other object in nature may be hot but the radiation waves are a fire by

'MALAIKA' ARE HIDDEN FORCES.

There is yet another aspect regarding 'Malaika' which is worth mentioning. These are hidden forces. According to the holy Quran 'Malaika' or the energy-waves came into existence earlier and the creation of material objects including man took place later. Moreover the above-said hidden creation was created from fire and man was created from clay or inorganic matter.

Thus it is said:-

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُونٍ ۝ وَالْجَانَّ خَلَقْنَاهُ مِن قَبْلُ مِن نَّارِ السَّمُومِ ۝

(15:26-27)

"We created man from old physically altered mud which after a lapse of time reached a certain stage of dryness. And the hidden forces, We had created before, from the fire of scorching wind."

The holy Quran used the word. ...جآن..root ج.ن.ن.both for material objects and as well as energy. For example, the word used for 'grave' is ...جنن...because it hides a dead body. Similarly a fetus inside the mother's womb is called. ....جنین.About Abraham, the messenger of Allah, it is said:

فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ اللَّيْلُ رَأَىٰ كَوْكَبًا

(6:76)

"When the night COVERED him over, he saw a planet".

لاجنّ بهٰذ الامر means, there is nothing hidden or secret in this matter. Arabs called those tribes who had permanent living as ..انس...and the wandering tribes who had no permanent dwelling as ..جن.because they kept hidden from the urban population. However, this differentiation is very much reduced in the present age on account of easy means of communication. Thus the words ....انس....and .جنّ...were used for civilised and uncivilised populations respectively. For example, it is said in the verse 72:1 :-

is said that Allah chooses His messengers from amongst the 'Malaika' and also from amongst the human beings.A messenger of God from amongst the human beings is called a نبی 'Nabi', on account of his being a recipient of divine message or divine guidance. He is also called a 'Rasool' on account of his being a deliverer of divine message. ...نبوت....'Nabuwwat' and ...رسالت..'Risalat' being thus the facets of the same coin. The means of communication between the Creator and ..انبیاء...(the human messengers of God) have been Malaika who carried to them the messages of the Creator, and the 'Ambia' who were also 'Rasools' further carried these messages to the human beings. The nature and working of these 'Malaika' (the former ones) which may be termed 'divine energy' is beyond the perception of human beings other than the 'Ambiya' themselves.

The forces (or the divine energy) which bring about a Psychological change in man, are also termed 'Malaika' by the Quran:

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا

وَلَا تَحْزَنُوا وَأَبْشِرُوا بِالْجَنَّةِ الَّتِي كُنتُمْ تُوعَدُونَ (41:30)

"Those who say, 'our Rabb (Cherisher and Sustainer) is Allah' and then stand upright and steadfast, the 'Malaika' descend on them, saying: fear not, nor grieve, but hear glad tidings of the paradise which you are promissed."

As the human intellect in the 7th century A.D. was far too immature to conceive the idea of energy waves and it remained so till recent past, the interpretation of the verses pertaining to the fundamental forms of energy in nature remained ambiguous uptil now.

Belief in 'Malaika' is part of our ایمان (Muslim Belief). However, the meaning of belief in 'Malaika' must be clear. It means the belief in the status given to them by the Quran and the status given by the Quran is that they are subservient to man. The more man gains knowledge of the laws that control the forces of nature, the more these forces bow down before man.

Abul Ala Maudoodi also attributes the above-said symbols to angels who draw out *souls*.

This mosaic of diversified translations is due to the fact that our commentators have been ignorant of the concept of 'radiation'.

However, I must make it clear that when I interpret the word 'Malaikha' as 'the fundamental forms of energy' in the universe, I refer to the physical world only. From this I mean the 'Malaika' that bow down before man or which can be made subservient to man, by gaining knowledge of them:

وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَٰٓئِكَةِ ٱسْجُدُوا۟ لِءَادَمَ فَسَجَدُوٓا۟

(2:34)
"Then We said to Malaika (the forces of nature): 'Bow down to Adam (mankind)' and they bowed down."

The Quran has also used the word 'Malaika' for another means of communication which forms a link between the Creator and the human world.

The Quran says:

ٱللَّهُ يَصْطَفِى مِنَ ٱلْمَلَٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَمِنَ ٱلنَّاسِ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ سَمِيعٌۢ بَصِيرٌ ۝

(22:75)
"Allah chooses the messengers from amongst the 'Malaika' and also from amongst the mankind. Lo! Allah has infinite vision and hearing."

The physical world, as well as the living world, get guidance from Allah. The physical world gets direct guidance by means of physical laws which are ingrained in its very substance. The animal world gets direct guidance by means of physical laws and by means of instincts. The human body, like the bodies of all other animals, gets direct guidance by means of instincts and physical laws, but human personality gets an indirect guidance through the messengers of God who are chosen by God from amongst the human beings. In the verse described above (22:75) it

فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا ..... "And thus readjust the shape of things (in the universe) by command of their Rabb."

يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ "That one day everything that is in commotion, will be in violent commotion."

It shall be interesting to quote here the commentaries and translations by some of our commentators, of the above-said verses. Abdullah Yousaf Ali says:

وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا "By the (angels) who tear out (the souls of the wicked) with violence."

وَالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا "By those who gently draw out (the souls of the blessed)."

وَالسّٰبِحٰتِ سَبْحًا "And by those who glide along (on errands of mercy)."

فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا "Then press forward as in a race."

فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا "Then arrange to do (the commands of their Lord)."

يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ "That one day everything that is in commotion will be in violent commotion."

Marmaduke Pickthall translates these verses as below:

وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا "By those who drag forth to destruction."

وَالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا "By the meteors rushing."

وَالسّٰبِحٰتِ سَبْحًا . - — — —By the lone stars floating

فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا "By the angels hastening."

فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا "And those who govern the events."

يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ "That the day when the first trumpet soundeth."

verses of the Quran (*Tafheemul-ul-Quran* Abul Ala Maudoodi volume 6, page 209).

However, these varied types of opinions are due to lack of knowledge of the forces which form the basis of all activities in nature i.e., the Radiation Waves.

Example 3-

There is yet another chapter of the Quran which begins with the verses of similar type.

As stated earlier, the making and breaking up process of chemical bonds goes on constantly in the universe. This process, however, depends on the amount of activation and maintenace energy available. With the increase in the amount of energy the bond making process increases up to a certain extent; beyound that limit the greater the energy, the more the speed and violence with which the bonds break. The radiation waves smoothly sail across the space and being of different wave lengths, one type exceeds the other in potency and penetration, and thus their consequent effects on environments are constantly changing. The whole universe is thus, perpetually in a state of commotion. The Quran describes this phenomenon as a witness to the occurrence of a greater commotion that is to come with certainty on the Day of Judgement.Thus it is said:

(79:1-6)

وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا ۝ ."By the (radiation waves) that undo (the bonds) with violence by penertating (into materials)."

وَالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا ۝ ."And by those that undo (the bonds) with ease;"

وَالسّٰبِحٰتِ سَبْحًا ۝ فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا ۝ "And by those that smoothly float, one exceeding the other (in the performance of a particular act)."

We know that the ionic and nuclear bonds are being made and unmade in every nook and corner of the universe. One form of energy is being converted into another. Matter is being converted into energy and *vice versa*. All that is surplus in nature is being sorted out and all that is capable of survival is being given one form after another. The evolutionary processes are thus carried out in perfect silence and harmony and all this depends on the radiation waves.The Quran describes this process as follows:

(77:1-7) وَالْمُرْسَلٰتِ عُرْفًا ۙ فَالْعٰصِفٰتِ عَصْفًا ۙ وَّالنّٰشِرٰتِ نَشْرًا ۙ

فَالْفٰرِقٰتِ فَرْقًا ۙ فَالْمُلْقِيٰتِ ذِكْرًا ۙ عُذْرًا اَوْ نُذْرًا ۙ

اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَوَاقِعٌ ؕ

"By the (radiation waves) that are sent forth for the benefit of humanity; those that turn into powder (all that is incapable of survival); and still those that diffuse and make things differentiated, one from the other; and make the law of (construction and destruction) unveiled (before the humanity); so that one may be able to justify his existence by a positive act or take warning by the destructive effect of a negative act. Assuredly that which you are promised must come to pass."

Again our commentators have affixed a variety of nouns for the adjective participles described in the above-said verses, thus making their purport ambiguous. Five qualities of an object or objects are described here without nouns. Some commentators attribute these qualities to one object and others to different objects. According to some, it is the 'winds' which are referred to in all the five verses. According to others, all the five verses refer to ...ملٰئکۃ.... Malaika-(angels). A third group says that the first 3 verses refer to 'winds' and last two refer to 'Malaika'. A fourth group says that the first two verses point towards 'winds' and the rest towards 'Malaika'. A fifth group says that the first verse refers to ملائکۃ الرحمۃ.'angels of mercy' and the second verse refers to ملائکۃ العذاب.'angels of destruction' and the rest three refer to the

Abul Ala Maudoohdi has also described these agencies as winds and clouds.

Maulvi Fateh Muhammad Jullundari has described these agencies, in all the four verses, as 'winds'. But in spite of such a variety of interpretations, those who consider the above said agencies to be 'Malaika' .....مَلٰٓئِكَةً are nearer to the truth, although their concept of the word مَلٰٓئِكَةً.....is ambiguous which makes their interpretations meaningless. The word ..مَلٰٓئِكَةً....'Malaika' therefore needs elucidation. Two different roots of the word 'Malaika' as it occurs in the Holy Quran, are found in Arabic dictionaries. One is .....ا ل ک.....which means 'to send messages'. The other is م ل ک...which means 'power or energy'. We know that physical communication between any one point of the universe to another is carried out through the agency of radiation. On the other hand, all energy, or the capacity for doing work, in the universe becomes manifest through radiation. Radiation waves, therefore, being the source of power as well as the means of communication, truly come under the term 'Malaika' as far as it relates to the physical world.

The outstanding functions of 'Malaike', as described by the Quran are (i) (51:4) فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا..the distribution of tasks over the universe; and (2) (79:5) فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا...the readjustment of the quality and quantity of the innumerable contents of the universe.

Thus we get a clear idea of the verses (51:1-4) by interpreting the word مَلٰٓئِكَةً...as the fundamental forms of energy. The verses (51:1-4) would thus mean "By the radiation waves that scatter energy all over the universe; by the gravitational fovrce which keeps the huge stars of multi-billion tons of mass perfectly balanced in space; by the state of ease and harmony with which these forces of nature work silently and distribute tasks by command of their Rabb, in all the nooks and corners of the universe."

Example 2-

There are other chapters in the Holy Quran with similar descripitions where the noun 'radiation' is not mentioned, but the adjective participles, described therein closely fit into the properties of radiation waves, rather than anything else.

different commentators. Some take it to be 'winds.' Others, however interpret these nouns as angels in all the four verses, or different things in each of the four verses. For instance, Abdullah Yousaf Ali translates these verses as follows:

وَالذّٰرِيٰتِ ذَرْوًا "By (the winds) that scatter broadcast.

فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا .."And those that lift and bear away heavy weight. (These may be winds that carry the heavy rain clouds or it may be moisture laden clouds themselves).

فَالْجٰرِيٰتِ يُسْرًا ."And those that flow with ease and gentleness. (These may be winds that fill the sails of the ships with gentle and favourable breezes that carry men and merchandise to their destinations or they may be ships themselves).

فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا "And those that distribute and apportion by command." (These may be winds or other agencies that distribute and apportion moisture or rain or atmospheric pressure, by fixed laws according to the commands of their Lord).

Marmaduke Pickthall has translated the above verses as follows:

وَالذّٰرِيٰتِ ذَرْوًا "By those that winnow with the winnowing."

فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا "And those that bear the burden (of the rains)."

فَالْجٰرِيٰتِ يُسْرًا ."And those which glide with ease (on the sea)."

فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا ."And those who distribute (blessings) by command.

In the name of Allah, the Rahman, the Raheem

MALAIKA

By
Dr. Syed Abdul Wadud

The subject of " *MALAIKA*" has been discussed in details by our commentators, ut as far as I know such discussions are without scientific basis. The human intellect dvanced step by step through ages. The more it advanced, the more the mysteries of ature got revealed, and the more all that by hidden became manifest, the more the Meaning of Quranic verses became clear. The Quran lays stress, again and again, upon he immutability of the laws that govern the phenomena of nature, as well as the laws given o mankind by means of revelation through messengers of God. The Quran projects the ormer as an evidence, in support of the truth of the latter. While doing so, the Quran not only deals with aspects pertaining to matter, it also deals with aspects pertaining to matter, it also deals with aspects pertaining to energy. A scrutinizing look at the verses that follow shall make this point clear.

The Quran in order to lay stress on the certainty of occurrence of some future events, such as those related to the Day of Judgment brings into evidence certain things in the form of oaths.* As these things Hare not given particular names, the commentators attars of the Quran being ignorant of the concept of energy, have attributed them to material objects.

The first few verses each of the chapters 51, 77 and 79 of the Holy Quran also begin with such oaths and as +51Hthere are certain common features in respect of these verses, we shall discuss them together.

EXAMPLE 1. The Quran Says:

وَالذّٰرِيٰتِ ذَرْوًا ۝ فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا ۝ فَالْجٰرِيٰتِ يُسْرًا ۝ فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا ۝
اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ ۝ وَّاِنَّ الدِّيْنَ لَوَاقِعٌ ۝

(٥١/١–٦)

"By those that scatter; by those that lift heavy weights; by the ease and gentleness with which they flow; and by those that distribute by divine command; verily that which you are promised is true; and verily the Day of Judgment must come to pass."

Four agencies are described in verses 1-4 as evidences or types of symbols of certainty of a Truth described in verse 5-6 that the day of Judgment must come to pass. Theses agencies are described by certain adjective participles, the nouns understood being taken differently by

---

Note: An oath is an innovation of the name of Allah, or some person or object, held sacred by the person using the innovation to witness the truth of a solemn affirmation and to emphasize that affirmation.